باسمہٖ سبحانہٗ

الملک الظاہر

سلطان العادل رکن الدین محمود

بیبرس بندقدار

مؤلفہ

طالب ہاشمی

قومی کتب خانہ ۶۵ ریلوے روڈ، لاہور
(پاکستان)

سلطان رکن الدین بیبرس

مصنّف — طالب

ناشران — محمد نصیر ہمایوں
برائے قومی کتب خانہ لاہور

طابع — نسیم ہمایوں

مطبع — تعمیر پرنٹنگ پریس
۱۹- فیروز پور روڈ۔ لاہور

ایڈیشن — اول

تعداد — دو ہزار (۲۰۰۰)

قیمت — ۱۰ روپے

فہرست مضامین

٦

سلطان بیبرس کے عہد کے چند اہلِ کمال ۲۵۷

اہم حواشی

اِنتساب

اُن شاہین نوجوانوں کے نام

جو

کفر و الحاد اور فسق و فجور کی طاغوتی قوتوں

کو

شکست دے کر

پاکستان میں اسلام اور صرف اسلام

کو

غالب کرنے کا عزم رکھتے ہیں

(طالب الہاشمی)

مردِ مُسلماں

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اُس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اُس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اُس کے سمندر کی موج دجلہ و دینیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اُس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیٔ اربابِ ذوق، فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل
مردِ سپاہی ہے وُہ، اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

دیباچہ

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ؕ

ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) کے عین وسط میں ـــــ جب بغداد کی عباسی خلافت کا انحطاط انتہا کو پہنچ چکا تھا، قاہرہ کی فاطمی خلافت دم توڑ چکی تھی، سلجوقی، زنگی اور ایوبی حکمران اپنی طاقت کو باہمی چپقلشوں میں ختم کر چکے تھے۔ یوسف صدیقؑ اور فراعنہ کی سرزمین مصر میں چشمِ فلک نے ایک عجیب نظارہ دیکھا، دشتِ قبچاق۔ قزوین اور کوہ قاف کے سفید فام باشندے جو چنگیز خاں کی دہشتناک "تاتارگردی" میں غلام بنا کر اہلِ مصر کے ہاتھ فروخت کیے گئے تھے، مصر کے تاج تخت کے مالک بن گئے۔ اور پھر پونے تین سو سال تک بحر و بر پر اس شان سے حکمرانی کی کہ مشہور مستشرق پروفیسر فلپ کے حتی" کے بیان کے مطابق:

"مشرق و مغرب کا کوئی حکمران اُن کی برابری کا دم نہیں بھر سکتا تھا اور غالباً (اس عرصہ میں) کوئی مسلمان حکمران اُن پر سبقت نہ لے جا سکا۔ انہوں نے تاتاریوں کا سیل روک دیا تھا۔ شام (و فلسطین) کا چپہ چپہ صلیبیوں سے خالی کرا لیا تھا۔ شام و لبنان کے عجیب و غریب عقائد کے حامل، مخالف فرقوں کو کچل ڈالا تھا اور اہلِ سنت کی برتری

قائم کر دی تھی۔ ان کی مملکت بہت وسیع اور محفوظ تھی جس میں مصر، شام، لبنان، فلسطین اور حجاز شامل تھے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو طریقہ چاہتے اختیار کرتے اور بدلے ہوئے حالات میں جس مسلک پر چاہتے گامزن ہوتے۔" (تاریخ لبنان از حتی)

فی الواقع ممالیک مصر کا دورِ حکومت تاریخ اسلام کا ایک شاندار باب ہے ان غریب الوطن سفید فام غلاموں کو مصر کے تاج و تخت تک جن حالات میں رسائی حاصل ہوئی وہ تِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ کی صحیح تفسیر پیش کرتے ہیں۔ الملک الظاہر سلطان رکن الدین بیبرس انہی غریب الدیار غلاموں کی جماعت کا ایک فرد تھا۔ وہ دمشق کی منڈی میں ایک حقیر رقم پر فروخت ہوا اور پھر ایک دن اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور بخت کی یاوری کی بدولت مصر کے تاج و تخت اور خزائن کا مالک بن گیا اس کی زندگی کے حالات پڑھ کر معاً سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے نشیب و فراز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

سلطان بیبرس کہنے کو تو اپنے سلسلہ (ممالیک بحری) کا چوتھا حکمران تھا لیکن حقیقت میں وہ پہلا مملوک فرماں روا تھا جس نے مملوک سلطنت کی بنیادیں استوار کیں اور اس کو ایک ایسی عالمی طاقت بنا دیا جس کا نام سن کر دشمنانِ اسلام کے جسموں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ سلطان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک نڈر مجاہد، ایک عظیم مدبّر اور ایک دوربین سیاست دان کی طرح مسائل و معاملات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا اور اپنی قوم کو شکستہ دلی اور پست ہمتی کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر اسے دشمن کے مقابلہ پر ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا اور دشمنانِ اسلام کو ایک غیر فانی عزم کے ساتھ للکار کر اپنی قوم کی قوتِ عمل کو مہمیز لگائی۔ وہ ایک ایسے نازک اور پُر آشوب دور میں جریدۂ عالم پر نمودار ہوا جب مسلمان تقریباً ڈیڑھ صدی سے صلیبی طالع آزماؤں

کی ستم رانیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے اور رہی سہی کسر فتنۂ تاتار نے پوری کر دی تھی۔ وحشی تاتاریوں کی بربریت اور غارت گری نے ان کی قوتِ عمل کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور ان پر ایسی دہشت طاری ہو چکی تھی کہ مؤرخ کا قلم اسے احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے کانپ اٹھتا ہے۔

علامہ ابن اثیر نے اس عبرت ناک صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"اللہ نے سب کے دلوں میں ایسی دہشت ڈالی، ایسے ایسے واقعات ظہور پذیر ہوئے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتے تھے۔ ایک شخص کی روایت ہے کہ ایک تاتاری ایک گاؤں میں داخل ہوا اور ایک ایک کر کے لوگوں کو قتل کرنے لگا۔ کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اس اکیلے آدمی کے مقابل اپنا بچاؤ کر سکتا۔ میں نے یہ روایت بھی سنی ہے کہ ایک تاتاری اپنے ایک قیدی کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے اس وقت اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس نے قیدی کو زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا اور اپنی تلوار ڈھونڈنے چلا گیا۔ کافی دیر بعد وہ تلوار لے کر آیا اور بدنصیب قیدی کو قتل کر دیا جس کو اتنا حوصلہ نہ پڑا کہ اٹھ کر بھاگ سکے۔ ایک اور شخص نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ میں سترہ آدمیوں کے ساتھ سڑک پر چلا جا رہا تھا کہ ہم نے ایک تاتاری سوار کو آتے دیکھا اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم ایک دوسرے کی مشکیں کس دیں۔ میرے ساتھی بلا تامل اس کے حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ آدمی اکیلا ہے اسے قتل کر کے اپنی جانیں بچالو۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں ڈر لگتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر یہ ہم سب کو مار ڈالے گا اس کو ختم کر ڈالو شاید اللہ ہمیں بچا لے لیکن

"میرے ساتھی اس قدر دہشت زدہ تھے کہ ان کو اس اکیلے تاتاری پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اللہ نے مجھے جرأت عطا کی اور میں نے اپنے خنجر سے اس تاتاری کو ہلاک کر ڈالا اور اس طرح ہم سب کی جانیں بچ گئیں۔"

تاتاریوں کی خون آشامی کی یہ کیفیت تھی کہ بعض مقامات پر انہوں نے کتوں اور بلیوں تک کو زندہ نہ چھوڑا۔ اُن کی وحشیانہ یلغار نے مسلمان ملکوں کو اس طرح دہشت زدہ کر دیا جیسے درختوں پر پالا گرتا ہے۔ تاتاری اپنی فتوحات کے نشہ میں اس قدر بدمست ہو گئے تھے کہ کھلم کھلا "مسلمانوں کے خدا" کا مذاق اڑاتے تھے نہ اُن کا کوئی ضابطۂ اخلاق تھا اور نہ وہ رحم سے آشنا تھے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ

"نیشاپور کے ایک شخص نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ وہ ایک مکان میں چھپ کر روشندان سے مسلمانوں کے قتلِ عام کا دل دوز منظر دیکھ رہا تھا۔ جب تاتاری کسی مسلمان کو شہید کرتے تو نعرۂ تکبیر کا مذاق اڑا کر "اللہ الہی" چلاتے۔ جب قتلِ عام کر چکے تو عورتوں کو پکڑ کر لے گئے میں نے انہیں سوار ہوتے، اپنی زبان میں گیت گاتے اور "اللہ الہی" چلاتے سنا۔"

ہلاکو نے جب عروس البلاد بغداد کو تاخت و تاراج کیا اور اس کے بعد عراق اور شام کے دوسرے شہروں کو بُری طرح پامال کیا تو وہاں سے مظلوم مسلمانوں کے تباہ حال قافلے پناہ لینے کے لیے مصر میں داخل ہونے لگے۔ انہوں نے تاتاریوں کی بربریت اور ان کی بے پناہ قوت کی داستانیں اہلِ مصر کو سنائیں تو اُن میں بھی دہشت پھیل گئی اور وہ سمجھنے لگے کہ تاتاری مافوق الفطرت قوت کے مالک ہیں اور ان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ انہی حالات میں رکن الدین بیبرس آگے بڑھا اور فقہائے مصر سے دہشت

اور خوف کی تاریکیوں کو دُور کرنا شروع کیا اس نے لوگوں کو بتایا کہ:

"اگر ہم اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ رکھیں اور پورے عزم و یقین کے ساتھ تاتاری کافروں سے نبرد آزما ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو شکست نہ دی جا سکے۔"

اس سے پہلے بیبرس صلیبیوں کے خلاف کئی معرکوں میں غیر معمولی عسکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کر چکا تھا اور اپنی بے مثل شجاعت اور جذبۂ جہاد کی بدولت مصر میں بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اہل مصر نے اس کی آواز میں بڑا وزن محسوس کیا اور پھر جب اس نے مملوک سرفروشوں اور دوسرے مجاہدین کو بڑی تیزی سے منظم کرنا شروع کیا اور ان کو مغلوں کا طریق جنگ اور ان کے مخصوص فنون حرب سکھائے تو اہل مصر کو محسوس ہوا کہ یاس و دہشت کے گھپ اندھیرے سے امید کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں۔ تیسرے مملوک فرماں روا ملک مظفر کے دربار میں ہلاکو کے سفیروں نے گستاخی اور بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تو بیبرس کے ایماء پر ان کے سر قلم کرا دیئے گئے اور قاہرہ کے بازاروں میں اُن کی لاشوں کی تشہیر کی گئی اس طرح بیبرس نے تاتاریوں کی قوت و شوکت کا کھلے بندوں تمسخر اُڑایا اور اُن کو ایک نہ بھولنے والا سبق دینے کی ذمہ داری قبول کی چند دن بعد جب اس نے معرکۂ عین جالوت میں "ناقابل تسخیر" تاتاریوں کو ذلت انگیز شکست دی تو مصر کی فضا سے دہشت اور بے یقینی کی تاریکیاں یکسر کافور ہو گئیں اور تمام عالم اسلام میں بیبرس کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ فی الحقیقت بیبرس کی اس کامیابی نے تاریخ کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ وہ صرف تاتاریوں ہی کا کامیاب حریف ثابت نہ ہوا بلکہ اس نے صلیبیوں کو بھی پے در پے ایسی کمر توڑ شکستیں دیں کہ اُن کے قدم ارض شام و فلسطین سے اکھڑ گئے۔ پھر وہ مار آستین باطنیوں کی طرف متوجہ ہوا جنہوں نے انتہائی نازک وقت میں اسلام کے بدترین دشمن، فرانسیسی بادشاہ لوئی نہم سے

محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی تھی اور اس کو انواع و اقسام کے تحائف بھیج کر اپنی اٹوٹ رفاقت کا یقین دلایا تھا۔ بیبرس نے ایک مجاہدانہ یلغار کر کے اُن کی شامی پناہ گاہوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور ان کی سیاسی اور عسکری قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر کے رکھ دیا۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے بیبرس کے عسکری کارناموں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"دوسری بڑی بڑی حکومتوں کے مقابلہ میں ملک ظاہر کی حکومت ایسی تھی جیسے ایک سمندر کے سامنے کوئی نہر یا چھوٹا سا دریا لیکن خدا کو یہی منظور تھا کہ دینِ حق میں جو رخنے پڑ گئے تھے اور مسلمانوں پر جو آفتیں یکے بعد دیگرے نازل ہو رہی تھیں ان سب کا دفعیہ اس چھوٹی سی حکومت کے ذریعہ ہو۔" (حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ للسیوطیؒ)

مصر کے دوسرے عباسی خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے سلطان بیبرس کی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

"جب دشمن ہمارے گھروں میں گھس آئے تھے اور انہوں نے قیامت کے فتنے برپا کر رکھے تھے ایسے نازک وقت میں سلطان رکن الدین بیبرس اپنی چھوٹی سی سلطنت کے باوجود امت مسلمہ کی امداد و اعانت کے لیے اٹھا اور اس نے کفر کے لشکروں کو منتشر کر کے رکھ دیا۔"

سلطان بیبرس کی یہ درخشاں عسکری کامیابیاں ہی تھیں جنھوں نے متعصب مغربی مورخین سے بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کی عظمت کا اعتراف کرایا۔

دورِ حاضر میں اہلِ مغرب تاریخ نویسی اور شخصیت نگاری کے فن میں معراجِ کمال پر پہنچے ہوئے ہیں لیکن یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور دکھ بھی کہ ان میں سے اکثر جب

تاریخ اسلام کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو بڑی بے دردی اور ناانصافی سے حقائق مسخ کرتے ہیں اور اسلام کی جلیل القدر شخصیتوں پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اپنے معمول کے مطابق انہوں نے سلطان بیبرس کی شخصیت اور کردار کے بارے میں بھی مقدور بھر زہر چکانی کی ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بیبرس اپنی عسکری صلاحیتوں اور جنگی کارناموں کے لحاظ سے "صلاح الدین ثانی" یا "نیا صلاح الدین" تھا اور ایک سپاہی کی حیثیت سے اس کا مرتبہ مشہور رومی جرنیل جولیس سیزر سے کسی صورت میں کم نہیں تھا۔

یوں تو سلطان بیبرس کے عسکری کارنامے ہی اس کو نامورانِ اسلام کی صف میں ممتاز مقام دلانے کے لیے کافی ہیں لیکن اس کی سیرت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور رفاہِ عام کے میدانوں میں بھی اس کے کارنامے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اس نے ملک کے اندر انتشار پسندانہ رجحانات کا خاتمہ کر کے قوم کے مختلف عناصر کو باہم مربوط کر دیا اور اپنی خارجہ حکمت عملی کے وضع کرنے میں ایسے محیّر العقول فہم و تدبر سے کام لیا کہ اقوامِ عالم میں مملوک حکومت کا مرتبہ اور وقار بہت بلند ہو گیا۔ دوست اس کی دوستی پر فخر کرتے تھے اور دشمن اس کے نام سے تھرّاتے تھے۔ پھر اس نے مصر میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء کر کے مسلمانوں کی امنگوں کو نہایت شاندار انداز میں پورا کیا اور دنیائے اسلام جو ان کو خلافت کے بغیر بے نور نظر آ رہی تھی پھر انوارِ خلافت سے جگمگانے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ملک میں کتاب و سنت کے مطابق ایک مثالی نظامِ حکومت اور معاشرہ قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی اور اس میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس کے عہد میں اعلیٰ اقتصادی نظام اور روز افزوں تجارت نے مملوک سلطنت کے باشندوں کو دنیا کے خوشحال ترین لوگوں میں شامل کر دیا۔ اور اس کے رفاہی کاموں نے فیض عام کے ایسے

چشمے جاری کر دیے جن سے اہلِ مصر و شام صدیوں تک مستفیض ہوتے رہے۔ بغرض سلطان بیبرس کی زندگی کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے وہ تاریخِ اسلام کی ایک مہتم بالشان شخصیت نظر آئے گا۔ یہ درست ہے کہ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اس کی ذات عیوب و نقائص سے خالی نہ تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کے محاسن اس کی کمزوریوں اور خامیوں پر غالب تھے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ملتِ اسلامیہ کے اعاظم رجال و ابطال میں نہ شمار کیا جائے۔ زمانۂ حال کے ایک فاضل مؤرخ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اپنی گراں مایہ تصنیف "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

> "ملک ظاہر بیبرس کے (عسکری) کارناموں کے علاوہ اس کے ذاتی اخلاق و عادات سے متعلق مؤرخین نے جو واقعات نقل کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ملک ظاہر کہنے کو غلام تھا مگر درحقیقت اس پر عباسی خاندان کے کئی بڑے بڑے شریف النسب خلفاء قربان کیے جاسکتے تھے۔"

بیبرس نے اپنے کردار و عمل کے جو ہمہ گیر اور دیرپا اثرات صفحۂ تاریخ پر چھوڑے ان کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کے تہوّر و شجاعت، جوانمردی، فریادرسی اور خدمتِ خلق کی داستانیں صدیوں تک عرب ممالک کے باشندوں کو گرماتی رہیں۔ یہ داستانیں آج کے ترقی یافتہ سائنسی دور میں بھی عربی تاریخ و ثقافت اور ادب کا سرمایہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے یہ اور اسی قسم کی دوسری داستانیں عربوں کے جذبۂ جہاد کے لیے مہمیز کا کام دیتی تھیں اور آج یہ عرب ممالک کے قہوہ خانوں اور مجالسِ لطف و تفریح میں نشاطِ طبع کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ گو ان داستانوں میں سے اکثر پر رومان اور اسرار کے دبیز پردے چڑھا دیے گئے ہیں تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ

پر برقرار رہتی ہے کہ رکن الدین بیبرس ایک سراپا عمل مسلمان تھا جس کے سینے میں ایمان اور یقین کی شمع فروزاں تھی۔ اس کا دل عوام الناس کے دلوں کے ساتھ دھڑکتا تھا اور وہ ہمیشہ ان کے دکھ درد دور کرنے کے لیے بیتاب رہتا تھا۔

مشرقی اور مغربی مؤرخین میں سے اکثر نے بیبرس کی قدآور شخصیت کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ــــ اور شاید یہ اوجھل ہو بھی نہیں سکتی تھی ــــ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی متعدد زبانوں بالخصوص عربی میں بیبرس کی سیرت پر کافی مواد موجود ہے۔ بدقسمتی سے اس معاملہ میں اگر کوئی زبان بے مایہ ہے تو وہ "اردو" ہے اور یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ تاریخ اسلام کے اس جلیل فرزند پر اس سے پہلے اردو زبان میں آج تک ایک کتاب بھی نہیں لکھی گئی۔ اگر اس کو مولانا الطاف حسین حالیؒ علامہ شبلیؒ، مولانا محمد حسین آزادؒ، مولانا عبدالرزاق کانپوریؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسے کسی انشا پرداز اور مؤرخ کا قلم میسر آجاتا تو جہاں اردو زبان میں ایک عظیم شہ پارے کا اضافہ ہو جاتا وہاں ہماری تاریخ کے اس "صلاح الدین ثانی" کی بوقلمونی شخصیت کے خدوخال نہایت احسن طریقے سے نمایاں ہو جاتے اور آج اردو دان طبقہ کی اکثریت اس کے بارے میں بالکل اندھیرے میں نہ ہوتی ــــ علم و ادب کے ان شہسواروں کی تقلید بھلا آج کسی سے کیا ہوگی تاہم کچھ نہ کرنے سے کچھ تو کرنا بہتر ہے۔ اسی لیے راقم الحروف نے اپنی علمی بے بضاعتی اور مذکورہ بزرگوں کی خاکِ پا کو اپنے لیے توتیائے چشم سمجھنے کے باوجود یہ جرأت کی ہے کہ اردو دان طبقہ کو الملک الظاہر رکن الدین بیبرس سے روشناس کرائے جس کے زریں کارناموں پر ملت اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ مؤلف کھلے بندوں اعتراف کرتا ہے کہ وہ یہ دعویٰ کرنے کا ہرگز اہل نہیں ہے کہ اس کی یہ حقیر تالیف سیرت نگاری کے اصولوں اور تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کرتی ہے تاہم اس ضمن میں یہ عرض کرنا بیجا نہ

ہوگا کہ اس کتاب کو معرض تحریر میں لانے کے محرک، اصحاب فہم و دانش کے وہ خیالات ہوئے ہیں جو انہوں نے قوموں کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ظاہر کیے ہیں۔ ان خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلاف و اکابر کے حالات کسی قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے لیے تازیانہ کا کام دیتے ہیں اس لیے ہمارا فرض ہے کہ جن لوگوں نے اپنی جد و جہد اور اخلاص عمل کی درخشندہ مثالیں چھوڑی ہیں، شخصیت پرستی اور شخصیت نگاری کے فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی شخصیت اور کردار کو منظر عام پر لائیں تاکہ سعی عمل کے جادہ پر جو نشان انہوں نے چھوڑے ہیں وہ امتداد زمانہ کی گرد سے دھندلے نہ ہو جائیں۔

غالباً انہی خیالات کے زیر اثر "مسدس مد و جزر اسلام" کے نامور خالق، مولانا الطاف حسین حالیؒ نے "حیات سعدیؒ" کے دیباچہ میں یہ الفاظ لکھے۔

"بیوگرافی ان بزرگوں کی ایک لازوال یادگار ہے جنہوں نے اپنی نمایاں کوششوں سے دنیا میں کمالات اور نیکیاں پھیلائی ہیں اور جو انسان کی آئندہ نسلوں کے لیے اپنی مساعی جمیلہ کے عمدہ کارنامے چھوڑ گئے ہیں۔ خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجہ کو پہنچ جاتی ہیں، ان کے لیے بیوگرافی ایک تازیانہ ہے جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور ان کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو ان کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے ـــــ ہمارے نزدیک۔ مسلمانوں کے اکابر و اسلاف میں بھی ایسے بہت سے افراد نکلیں گے جن کے بڑے بڑے کام اور ان کے کمالات قوم کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور موجودہ نسلوں کا فرض ہے کہ ان کا نام زندہ کرنے اور آئندہ نسلوں

کا دل بڑھانے کے لیے ان کے فضائل اور کمالات دنیا میں شائع کریں۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی مولانا عبدالرزاق کانپوری کے مندرجہ ذیل الفاظ بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں جو انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "البرامکہ" کے دیباچہ میں لکھے۔

"عموماً تصنیف اور تالیف کی راہیں نہایت سخت اور خطرناک ہیں۔ خصوصاً تاریخ نویسی اور سیرت نگاری، یہ وہ سنگلاخ گھاٹیاں ہیں کہ جن میں قلم کا مسافر بھی باوجودیکہ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ رکھتا ہے، ہر ہر قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے۔"

بہر صورت راقم الحروف سے بُرا یا بھلا جو کچھ بھی بن پڑا ہے اس کتاب کی صورت میں پیش کر دیا ہے اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اس کتاب کو سلطان رکن الدین بیبرس کا جامع تذکرہ کہنا محض تعلّی ہے تاہم اسے یہ امید ضرور ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی بنیاد کا کام دے گی جس پر آئندہ ایک رفیع الشان عمارت تعمیر کی جا سکے گی۔ اگر قارئین کرام، مؤلف یا ناشرین کو اس کتاب کے اسقام سے آگاہ کر سکیں تو یہ اُن کا احسان اور کرم ہو گا۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

احقر العباد
طالبؔ الہاشمی
لاہور

۵ ذی قعدہ ۱۳۸۸ھ
۲۴ جنوری ۱۹۶۹ء

ممالیکِ مصر کے پیش رو

خلافتِ عبّاسیہ —— عہد بہ عہد

۱۳۲ھ ہجری میں جب بنو عباس کے ہوا خواہوں نے ابو مسلم خراسانی کی قیادت میں بنو امیہ کے قصرِ خلافت کو زمین بوس کر دیا تو عباسیوں نے اس کے کھنڈروں پر امویوں کے خون کا چھڑکاؤ کر کے اپنی خلافت کی بنیاد رکھی۔ اگرچہ اس خلافت کے آغاز کے چھ سال بعد ہی ایک اموی شہزادے عبد الرحمٰن بن معاویہ (بن ہشام) نے اندلس (ہسپانیہ[1]) میں ایک خود مختار حکومت قائم کر لی۔ تاہم سمندر پار کی اس اموی حکومت سے عباسی خلافت پر کوئی خاص اثر نہ پڑا اور وہ برابر ترقی کی منزلیں طے کرتی گئی یہاں تک کہ مامون الرشید (ابن ہارون الرشید) کے عہد میں اس کا آفتاب کمال نصف النہار پر چمکنے لگا اور اس کے جاہ و جلال نے تمام دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ لیکن "ہر کمالے را زوالے" مامون الرشید کے بعد اس عظیم سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ زوال و انحطاط کا یہ سلسلہ دو سو برس تک جاری رہا۔ اس زمانے میں عباسی خلفاء محض نام کے خلفاء رہ گئے۔ اصل اقتدار ترک فوجیوں کے ہاتھ میں تھا۔ مرکز کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں کے حاکم خود مختار حکمران بن بیٹھے۔ ان کی خود سری اور قوت کا یہ حال تھا کہ خلفاء ان سے خوف کھاتے تھے اور ان کی مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔ نوبت بایں جا رسید کہ پانچویں صدی

---

[1] (Spain)

ہجری کے ربع اول میں عباسی خلافت مٹنے کے قریب پہنچ گئی

سلجوقی

عین اسی زمانے میں صفحۂ عالم پر سلجوقیوں کا ظہور ہوا۔ یہ لوگ نہایت جفاکش اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور شجاعت میں قرنِ اول کے عربوں سے مماثلت رکھتے تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے سرحدِ چین سے بحرِ ابیض کے سواحل تک اور عدن سے لے کر خوارزم اور انجاز تک چھا گئے۔ انہوں نے تمام چھوٹی بڑی خود مختار حکومتوں کو مٹا کر اسلامی سلطنت کو پھر متحد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی خلیفۂ عباسی کو رسمی طور پر اپنا پیشوا اور سربراہ تسلیم کر لیا۔ اس طرح سلجوقیوں کی عالمگیر قوت کے سہارے خلافتِ عباسیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ پھر روشن ہو گیا۔

سلاجقۂ عظام (طغرل بیگ۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ) کا دورِ حکومت مسلمانوں کی اقبال مندی کے بہترین زمانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مسلمان وسعتِ سلطنت شان و شوکت۔ رعب و دبدبہ۔ طاقت و ثروت۔ تہذیب و معاشرت۔ اخلاق و زینت علم و ہنر۔ تحقیق و اجتہاد غرض ہر لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں پر سبقت لے گئے لیکن بدقسمتی سے یہ عہدِ زریں بہت مختصر ثابت ہوا۔ ۴۸۵ھ ؍ ۱۰۹۲ء میں ملک شاہ کی وفات کے معاً بعد عظیم سلجوقی سلطنت میں زوال و انحطاط کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس کی وجہ ملک شاہ کے جانشینوں کی خانہ جنگی تھی جس نے ملتِ اسلامیہ کو پھر انتشار اور پراگندگی میں مبتلا کر دیا۔

حروبِ صلیبیہ کا آغاز

اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر یورپ کے صلیبی طالع آزماؤں نے بلادِ اسلامیہ پر یلغار کر دی اور ۴۹۰ھ ؍ ۱۰۹۷ء میں قونیہ کی سلجوقی ریاست کو پامال کرنے کے بعد

انطاکیہ کا محاصرہ کر لیا۔ انطاکیہ کے بہادر مسلمانوں نے کئی ماہ تک ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن جب ان کو کسی طرف سے کوئی مدد نہ پہنچی تو وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ انطاکیہ پر اپنا قبضہ مستحکم کر کے صلیبیوں کا طوفان بلا تمیزی بلاد شام و فلسطین میں پھیل گیا۔ یہاں تک کہ ۴۹۲ھ ۱۰۹۹ء میں یروشلم (بیت المقدس) پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح ایک مسلمان مؤرخ کے قول کے مطابق مسلمانوں نے عیسائیوں کے ہاتھ سے پہلی مرتبہ ایسی فاش شکست کھائی۔ کہ خالد بن ولیدؓ سے لے کر الپ ارسلانؒ تک تمام غازیانِ اسلام کی سرفروشیوں پر پانی پھر گیا۔ یہ خانہ جنگی کا سب سے زیادہ ہولناک نتیجہ تھا۔

مسلمانوں کی بے بسی

ایڈیسہ (الرہا) انطاکیہ اور یروشلم کے بعد صلیبیوں نے آہستہ آہستہ عکہ صور، طرابلس الشام اور دوسرے بہت سے شہر اور علاقے بھی مسلمانوں سے چھین لیے اور وہاں قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ عباسی اور فاطمی خلافتوں کی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ وہ "ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کا مصداق بنی ہوئی تھیں اور مسلمانوں کی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ دراصل ان میں اتنی سکت ہی نہ تھی کہ صلیبی جنونیوں کے طوفان کو روک سکیں۔ غرض فلسطین، شام اور لبنان کے مسلمانوں پر بڑا نازک وقت آ پڑا تھا۔ وہ کئی سال تک صلیبیوں کے وحشیانہ مظالم کی چکی میں پستے رہے۔

عماد الدین زنگیؒ

آخر غیرتِ حق کو حرکت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک چھوٹے سے مسلمان حکمران

کو صلیبیوں کے مقابلے پر کھڑا کر دیا جس نے صلیبی حملوں کے سیلاب کو روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ یہ مجاہد حلب اور موصل کا حکمران عماد الدین زنگی رح تھا اس نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دے کر ان سے بہت سے شہر اور علاقے خالی کرا لیے۔ عماد الدین رح کا ارادہ تھا کہ صلیبیوں کو تمام شام و فلسطین سے بیک بینی و دوگوش نکال دے لیکن بد قسمتی سے اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ کیونکہ ۵۴۱ھ ۱۱۴۶ء میں ایک بدبخت غلام نے اس کا چراغِ حیات گل کر دیا۔ اس کی شہادت سے مسلمانوں کو جس قدر صدمہ ہوا، صلیبیوں کو اسی قدر خوشی ہوئی۔ چنانچہ فرانسیسی مورخ موسیو مچاڈ لکھتا ہے کہ:

"عماد الدین زنگی کی موت کی خبر نے عیسائیوں کو اپنی شکستوں پر تسلی اور تسکین دی اور انہوں نے اس قدر مسرت کا اظہار کیا کہ گویا مسلمانوں کی تمام طاقت کو انہوں نے دفعۃً گرتے دیکھا ہے"

نور الدین زنگی رح

عماد الدین شہید رح کے چھوڑے ہوئے کام کو اس کے نامور فرزند نور الدین زنگی رح نے جاری رکھا اور بہت جلد صلیبیوں کو یہ احساس کرا دیا کہ عماد الدین رح کی شہادت پر ان کی خوشی بے جا تھی۔ اس کی پے در پے ضربوں سے صلیبیوں میں کھلبلی مچ گئی اور وہ اپنے کئی شہر اور قلعے نور الدین رح کے حوالے کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صلیبیوں کو سب سے بڑا دھکا اس وقت لگا جب نور الدین رح نے ان کے ایک بڑے مستقر اور ارضِ مشرق میں پہلی صلیبی ریاست "الرہا" (ایڈیسہ) پر قبضہ کر لیا۔ "الرہا" پر مسلمانوں کا قبضہ ہونے کی خبر یورپ کے عیسائیوں پر بجلی بن کر گری اور ان میں سخت ہیجان بپا ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا جس میں فرانس

اور جرمنی کے بادشاہ بھی شامل تھے۔ یہ لشکر طوفان کی طرح ارضِ شام کی طرف بڑھا اور دمشق کو جا گھیرا۔ سلطان نورالدین اور اس کے بھائی سیف الدین غازی کو یہ خبر ملنے کی دیر تھی کہ وہ حلب اور موصل سے اپنی فوجیں لے کر دمشق کے مسلمانوں کی مدد کے لیے آ پہنچے۔ ان کو دیکھ کر حملہ آوروں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ محاصرہ اٹھا کر فلسطین کی طرف بھاگ گئے۔ اس طرح دوسری صلیبی جنگ عیسائیوں کی شرمناک پسپائی پر منتج ہوئی۔ اس کے بعد سلطان نورالدین مصر کی طرف متوجہ ہوا جو اس زمانے میں صلیبیوں کی سازشوں اور حملوں کا ہدف بنا ہوا تھا۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار شیرکوہ کو فوج دے کر مصر بھیجا جس نے عیسائیوں کو شکست دے کر وہاں سے نکال دیا اور فاطمی خلیفہ العاضد کا وزیر بن کر مصر کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ جب کچھ عرصے کے بعد شیرکوہ نے وفات پائی تو فاطمی خلیفہ نے اس کے بھتیجے صلاح الدین یوسف بن نجم الدین ایوب کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں صلاح الدین نے نورالدینؒ کے حکم سے فاطمی خلافت کا خاتمہ کر دیا اور مصر میں بھی عباسی خلیفہ کا خطبہ جاری کر دیا۔

سلطان نورالدینؒ کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ بیت المقدس کو صلیبیوں کے پنجے سے چھڑائے لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء میں یہ تمنا دل ہی میں لیے ہوئے فوت ہو گیا۔

سلطان نورالدینؒ بڑا شجاع، منتظم، خدا ترس اور عدل پرور حکمران تھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی اور اسلام دشمن طاقتوں کو لوہے کے چنے چبوا دیے۔

صلاح الدین ایوبیؒ

نورالدین کی وفات کے بعد اس کا بیٹا الملک الصالح اسمٰعیل گیارہ برس کی عمر

میں تخت نشین ہوا لیکن اس کے ترک امرا نے حصولِ اقتدار کے لیے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ صلاح الدین نے اُن کو مصر سے بار بار پیغام بھیجے کہ اپنے باہمی تنازعات کو ختم کر دیں لیکن ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ فی الحقیقت صلاح الدین کا عروج ان کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنے جھگڑے تو کیا ختم کرنے تھے ملک صالح کو بھی اس کا دشمن بنا دیا۔ صلاح الدین مجبور ہو کر مصر سے شام آیا اور چند ماہ کے اندر اندر ملک صالح اور اس کے عاقبت نااندیش حواریوں کو مغلوب کر لیا۔ اس طرح مصر کے علاوہ تمام شام اور حجاز کی حکومت بھی اس کے قبضے میں آ گئی تاہم اس نے اپنے مرحوم آقا کے فرزند سے نہایت اچھا سلوک کیا اور حلب اور اُس کے آس پاس کا علاقہ اسی کے پاس رہنے دیا اس کے ساتھ ہی اس نے عباسی خلیفہ کو اپنی اطاعت کا یقین دلایا جس نے نہایت خوشی کے ساتھ اس کو خلعت اور حکومت کی سند بھیج دی۔ اس کے بعد وہ مصر واپس چلا گیا۔

ملک صالح نے ۵۷۷ھ ۱۱۸۱ء میں وفات پائی تو ترک سرداروں کے باہمی تنازعات نے پھر سر ابھارا۔ صلیبیوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور مسلمانوں کے قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ سلطان صلاح الدین کو یہ خبریں پہنچیں تو اس کی شمشیرِ خارا شگاف نیام سے باہر آ گئی۔ وہ فوراً مصر سے شام پہنچا اور پہلے ترک اُمرا کی خانہ جنگیوں کو ختم کیا اور پھر صلیبیوں کے خلاف زبردست جہاد کا آغاز کر دیا۔

سلطان نے سب سے پہلے طبریہ کی جھیل کے قریب حطین کے مقام پر صلیبیوں کے ایک زبردست لشکر کو شکست فاش دی۔ اس لڑائی میں دس ہزار صلیبی جن میں بڑے بڑے نامور شہسوار شامل تھے، مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے اور یروشلم کے بادشاہ گوئی۔ اس کے بھائی جافری۔ کرک کے حاکم ریجینا لڈ (ہنفری یا برنس ارناط) اور کئی دوسرے عیسائی سردار قیدی بنا لیے گئے۔ اس عظیم

فتح کے بعد سلطان نے عیسائیوں کے دوسرے مقبوضات کا رخ کیا اور تھوڑی ہی مدت میں ان کے بیسیوں قلعے بغیر کسی خاص مزاحمت کے فتح کر لیے۔ ان میں سے چند اہم قلعوں اور شہروں کے نام یہ ہیں:

نابلس۔ حیفا۔ قیصاریہ۔ صفوریہ۔ عکہ۔ اسکندرونہ۔ ہونین۔ ناصرہ یافا۔ اربحا۔ ارسوف۔ صرفند۔ صیدا۔ بیروت۔ داروم عسقلان شقیف۔ ہرمز۔ تل احمر۔ جلیل۔ اطرون۔ رملہ۔ جبل الخلیل بتجدل یابا قلعہ ابی الحسن۔ تل صافیہ۔

فتح بیت المقدس

اب سلطان نے آگے بڑھ کر ۱۵ رجب ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء کو یروشلم (بیت المقدس) کا محاصرہ کر لیا۔ ایک لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ساٹھ ہزار مسلح سپاہی تھے۔ انہوں نے زبردست مزاحمت کی لیکن سلطان کی مجاہدانہ یلغار کے سامنے پانچ دن سے زیادہ نہ ٹھہر سکے اور ۲۰ رجب ۵۸۳ھ / ۱۱۸۷ء کو ہتھیار ڈال دیے۔ نوّے سال پہلے جب صلیبیوں نے اس شہر کو فتح کیا تھا تو انہوں نے وہاں کے مسلمانوں پر ایسے ہولناک مظالم توڑے تھے کہ ان کا حال پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن عالی حوصلہ سلطان نے شہر کے سب باشندوں کو امان دے دی۔ یہی نہیں بلکہ ان کو یہ اجازت بھی دے دی کہ جس قدر مال و اسباب خود اٹھا کر لے جا سکتے ہوں لے جائیں۔

تیسری صلیبی جنگ

یروشلم کی فتح کی خبر سن کر یورپ کے بڑے بڑے عیسائی بادشاہ متحد

ہو کر فلسطین پر چڑھ دوڑے۔ ان میں انگلستان کا بادشاہ رچرڈ (جو اپنی بہادری کی وجہ سے رچرڈ شیر دل کہلاتا تھا) فرانس کا بادشاہ فلپ اور جرمنی کا بادشاہ فریڈرک بار بروسہ بھی شامل تھے۔ یہ صلیبی یلغار تیسری صلیبی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس جنگ میں صلیبی زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکے وہ یہ تھا کہ انہوں نے دو سال کے محاصرے کے بعد ۵۸۷ھ / ۱۱۹۱ء میں عکہ کو فتح کر لیا۔ اس کی وجہ سلطان صلاح الدین کی علالت اور قلعے میں رسد کی شدید قلت تھی۔ عکہ کی فتح کے بعد وہ یروشلم کی طرف بڑھے لیکن عسقلان کے قریب سلطان نے ان کو وہ تاریخی شکست دی جس نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی اور رچرڈ شکستہ دلی کے عالم میں سلطان سے صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اس صلح کی رُو سے سارے شام و فلسطین پر صلاح الدین کی حکومت تسلیم کر لی گئی البتہ عکہ سے عسقلان تک ایک تنگ ساحلی علاقہ عیسائیوں کے قبضے میں رہا۔ اس جنگ سے صلیبیوں کا اصل مقصد تو یروشلم پر قبضہ کرنا تھا لیکن وہ اس میں بری طرح ناکام رہے۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد سلطان صلاح الدین نے ۲۷ صفر ۵۸۹ھ (۴ مارچ ۱۱۹۳ء) کو رحمتِ خداوندی کے دامن میں آرام پایا۔

سلطان نور الدینؒ کی طرح سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا شمار بھی تاریخ اسلام کے مثالی حکمرانوں میں ہوتا ہے اور مغربی مؤرخین بھی اس کے محاسن اور عظمتِ کردار کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ جہاں ایک بے مثل شہسوار، ایک جری تیغ زن اور ایک نڈر اور قابل جرنیل تھا وہاں ایک ایسا دیندار، علم دوست، عادل، مخیر اور رحم دل حکمران بھی تھا جس نے اپنی زندگی جہاد فی سبیل اللہ اور مخلوقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ فی الحقیقت وہ اپنے دور کی اسلامی قوت و شوکت کا نشان اور خلافتِ عباسی کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ اس کی رحلت سے

تمام عالمِ اسلام بے نور ہو گیا۔ اس کی سیرت پر مختلف زبانوں میں آج تک اس
قدر کتابیں لکھی جاچکی ہیں کہ شاید ہی کسی اور مسلمان حکمران پر لکھی گئی ہوں۔

صلاح الدینؒ کے جانشین

خانہ جنگی

سلطان صلاح الدین کی وفات کے بعد مصر و شام میں بعینہٖ وہی حالات پیدا
ہو گئے جو سلطان ملک شاہ سلجوقی کی وفات کے بعد سلجوقی سلطنت میں پیدا ہوئے
تھے۔ سلطان نے اپنی زندگی ہی میں سلطنت کو اپنے تین بڑے بیٹوں میں تقسیم کر
دیا تھا۔ ابو الفتح عماد الدین عثمان (ملک العزیز) کو مصر۔ ابو الحسن نور الدین
علی (ملک الافضل) کو دمشق اور ابو منصور غیاث الدین غازی (الملک الظاہر) کو
عراقِ عجم کی حکومت ملی اور دوسرے بیٹوں کو بڑے بھائیوں کے ماتحت چھوٹے
چھوٹے علاقوں کی امارت عنایت ہوئی۔ سلطان کا خیال تھا کہ اس طرح سب
بھائی ایک دوسرے کے دست و بازو بنے رہیں گے لیکن اس کی آنکھیں بند
ہوتے ہی تینوں بھائیوں میں جھگڑے شروع ہو گئے۔

چوتھی صلیبی جنگ

اس موقع کا فائدہ اٹھا کر ۵۹۱ھ/۱۱۹۵ء میں یورپ کے عیسائی پھر فلسطین
پر چڑھ دوڑے اور چوتھی صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا۔ یہ بھائی تو آپس میں لڑتے
رہے لیکن ان کے چچا الملک العادل (ابن نجم الدین ایوب) والیٔ کرک نے آگے

بڑھ کر صلیبیوں کو روکا۔ عرصہ تک دونوں فوجوں میں معرکے ہوتے رہے لیکن ملک عادل نے صلیبیوں کو بیروت سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ بالآخر انہوں نے مجبور ہو کر مسلمانوں سے صلح کر لی۔

الملک العادل

اسی اثنا میں ملک عزیز نے وفات پائی۔ محرم ۵۹۵ھ / ۱۱۹۸ء اور امرائے سلطنت نے اس کے آٹھ سالہ فرزند کو ملک منصور کا لقب دے کر تختِ مصر پر بٹھا دیا۔ ایک نابالغ بچہ بھلا حکومت کا انتظام کیا کرتا۔ سلطنت میں پھر ابتری پھیلنے لگی۔ یہ دیکھ کر ملک عادل نے شوال ۵۹۶ھ / ۱۱۹۹ء میں علماء کے فتوے کے مطابق اس کو تخت سے اتار کر عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ملک عادل نے سب سے پہلے ایوبی سلطنت کو جو کئی حصوں بخروں میں تقسیم ہو چکی تھی متحد کیا اور ۵۹۸ھ / ۱۲۰۱ء تک سارے مصر، شام، میسوپوٹیمیا اور عرب میں پھر ایک طاقتور حکومت قائم کر دی۔ اس طرح سلطان صلاح الدین کے دورِ حکومت کی یاد تازہ ہو گئی۔

پانچویں صلیبی جنگ

۶۰۱ھ / ۱۲۰۴ء میں پاپائے روم اینو سینٹ ثالث کی دعوت پر اہل یورپ نے پانچویں صلیبی جنگ کا ارادہ کیا اور ایک زبردست فوج فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کی لیکن خوش قسمتی سے اس فوج کا رخ قسطنطنیہ کی طرف مڑ گیا۔ اس نے اپنی ہی ہم مذہب بازنطینی مملکت میں داخل ہو کر اس کو خوب ویران کیا اور پھر وہاں سے ہی واپس چلی گئی۔

چھٹی صلیبی جنگ

۶۱۳ھ ۱۲۱۵-۱۶ء میں صلیبیوں نے چھٹی صلیبی جنگ چھیڑ دی اور ان کی ڈھائی لاکھ فوج نے بڑے ساز و سامان کے ساتھ شام پر حملہ کر دیا۔ کئی شامی شہروں کو تاخت و تاراج کرتے ہوئے یہ فوج مصر میں جا داخل ہوئی اور دریائے نیل کے ڈیلٹا میں دمیاط کا محاصرہ کر لیا۔ ملک عادل اس زمانے میں شمالی شام میں تھا۔ وہ صلیبیوں کے مقابلے کے لیے مصر کو روانہ ہوا لیکن راستے میں ہی اس کو پیغام اجل آ پہنچا اور ۷ رجمادی الاول ۶۱۵ھ (۲۱ راگست ۱۲۱۸ء) کو وہ عالم فانی سے عالم بقا کو سدھار گیا۔

الملک الکامل

ملک عادل کے بعد اس کا بیٹا الملک الکامل ابو المعالی ناصر الدین محمد مصر کا فرماں روا ہوا۔ اس وقت چھٹی صلیبی جنگ جاری تھی۔ صلیبیوں نے طویل محاصرے کے بعد دمیاط کو فتح کر لیا اور وہاں کی مسلمان آبادی کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس کے بعد انہوں نے قاہرہ کی طرف پیش قدمی کی۔ ملک کامل اپنے بھائی ملک معظم (شرف الدین عیسیٰ) کے ساتھ ان کے مقابلے کے لیے بڑھا اور دریائے نیل کے بند توڑ ڈالے۔ صلیبی چاروں طرف سے گہرے پانی میں گھر گئے اور ان کے لیے اپنی جانیں بچانا مشکل ہو گیا۔ مجبور ہو کر انھوں نے صلح کی درخواست کی اور دمیاط کا شہر خالی کر کے واپس چلے گئے۔ ان کے واپس جاتے ہی دونوں بھائیوں میں ناچاقی پیدا ہو گئی۔ اس موقع پر ملک کامل نے نہایت عاقبت نااندیشی سے کام لیا اور فریڈرک ثانی فرماں روائے جرمنی و صقلیہ سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ اس کا مقصد فریڈرک کو شام آنے کے لیے آمادہ کرنا تھا۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فریڈرک ۶۲۹ھ ۱۲۳۱-۳۲ء میں شام

میں داخل ہوگیا۔ اور ملک کامل سے دس سال چھ مہینے اور دس دن کے لیے اس شرط پر دوستانہ معاہدہ کرلیا کہ بیت المقدس۔ بیت لحم اور ناصرہ کے علاوہ یافا اور عکہ کے درمیان جتنے شہر تھے سب اس کے حوالے کردیے جائیں۔ اس ناپاک معاہدہ نے صلیبیوں کی دیرینہ آرزو پوری کردی۔ اور جس سرزمین مقدس کی خاطر ہزاروں مسلمانوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں، فریڈرک ثانی خون کے ایک قطرہ تک کی قربانی دیئے بغیر اس میں داخل ہوگیا۔ اس سانحۂ عظیم سے عالم اسلام میں قیامت برپا ہوگئی رنج وغم کے اظہار میں ماتمی جلوس نکلے۔ مسجدوں میں اذانیں موقوف کردی گئیں باجماعت نمازوں کو ملتوی کردیا گیا۔ علمائے درس وتدریس کو ترک کردیا۔ اور دارالافتا کے دروازے بند کردیے گئے لیکن یہ سب احتجاجات بعد از وقت تھے مسلمان آٹھ سال تک صلیبی تسلط کے نیچے کراہتے رہے تا آنکہ ملک معظم کے فرزند اور ملک کامل کے بھتیجے ابو نصر داؤد والیٔ حران نے سنہ ۶۳۷ھ میں بیت المقدس کو پھر عیسائیوں سے چھین لیا۔ اس سے دو سال پہلے ملک کامل فوت ہوچکا تھا۔

ملک عادل ثانی

ملک کامل کی وفات کے بعد امراء نے اس کے نوعمر بیٹے سیف الدین ابوبکر کو الملک العادل ثانی کا لقب دے کر مصر کے تخت پر بٹھایا مگر دو سال کے بعد اس کے بھائی نجم الدین ایوب نے مصری امراء سے مل کر اس کو معزول کردیا۔

الملک الصالح نجم الدین ایوب

ملک عادل ثانی کی معزولی کے بعد اہل مصر نے ذی الحجہ ۶۳۷ھ میں الملک الصالح نجم الدین ایوب کی بیعت کرلی۔ ملک صالح ایک بیدار مغز حکمران ثابت ہوا اور اس نے اپنی تمام تر مساعی ایوبی سلطنت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنے کے لیے

وقف کردیں۔ کئی سال کی طویل جدوجہد کے بعد وہ اپنی کوششوں میں خاصی حد تک کامیاب ہو گیا۔ اور مصر کے علاوہ شام، حجاز اور کئی دوسرے علاقوں پر بھی اس کا مؤثر اقتدار قائم ہو گیا۔

مملوکوں کے عروج کا آغاز

ملک صالح کے برسرِ اقتدار آنے سے چند سال پہلے تاتاریوں کے ہولناک فتنے کا آغاز ہو چکا تھا۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) تاتاریوں کے حملوں کے دوران میں دشت قبچاق۔ قزوین اور کوہ قاف (سرکیشیا) وغیرہ کے علاقوں میں سے بہت سے لوگ بھاگ کر اسلامی ملکوں میں آ گئے تھے اور صاحبِ ثروت لوگوں نے ان کو کثرت سے خرید کر مصر میں فروخت کر دیا تھا۔ یہ لوگ کہنے کو تو مملوک (غلام) تھے لیکن صلیبی لڑائیوں میں اپنی تلوار کے جوہر دکھا کر وہ ایوبی سلطنت میں بڑے بڑے عہدوں پر جا پہنچے تھے۔ تاہم انہوں نے ایک منظّم قوت کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی۔ جب ملک صالح تخت نشین ہوا تو عمائدِ سلطنت میں بہت سے مملوک امراء بھی شامل تھے۔ اس کو ان لوگوں کے اوصاف و خصائل بہت پسند آئے اور اس نے سرکیشی مملوکوں کو بڑی کثرت سے خریدنا شروع کر دیا یہاں تک کہ ان کی تعداد بارہ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی۔ ملک صالح نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی جس کا اثر یہ ہوا کہ ان میں سے اکثر نہ صرف فنونِ جنگ میں غیر معمولی قابلیت کے مالک بن گئے بلکہ علومِ اسلامی (قرآن، حدیث اور فقہ) میں بھی درجۂ کمال تک پہنچ گئے۔ سلطان نے ان مملوکوں کی ایک باقاعدہ فوج بنائی جو نہایت منظّم اور فنّ حرب و ضرب میں طاق تھی۔ اس نے اپنے ذاتی محافظ دستہ (باڈی گارڈ) کو بھی اسی فوج سے منتخب کیا۔ اس کے علاوہ اس نے مملوکوں کو اپنی سلطنت اور دربار میں بھی بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا۔ اس طرح

مملوک، سلطنتِ ایوبیہ میں ایک فعّال اور مؤثر قوت بن گئے۔ تاہم سلطان نے ان کو بے قابو نہ ہونے دیا اور ان کی ایک بڑی تعداد کو جزیرہ روضہ میں آباد کر دیا جہاں ان کی رہائش کے لیے بیرکیں بنوا دیں۔ بعض مملوک امراء نے وہاں اپنے طور پر بھی مکانات اور قلعے تعمیر کر لیے۔ چونکہ اس مقام پر دریائے نیل کی دو شاخیں ملتی ہیں اور اس کو بحر کہا جاتا ہے اس لیے یہ لوگ "ممالیک بحری" کہلائے۔ کچھ مملوکوں نے سلطان صلاح الدین کے تعمیر کردہ قلعۂ قاہرہ کے برجوں میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے وہ "ممالیک برجی" کے نام سے مشہور ہوئے۔

ساتویں صلیبی جنگ

۶۴۷ھ / ۱۲۴۹ء میں یورپی صلیبیوں کی باسی کڑھی میں پھر ابال آیا اور انہوں نے لوئی (لوئیس) نہم شاہِ فرانس کی قیادت میں ساتویں صلیبی جنگ چھیڑ دی اس دفعہ ان کا خاص ہدف مصر تھا۔ عیسائی مؤرخین کا بیان ہے کہ تمام صلیبی جنگوں میں یہی جنگ حقیقی معنوں میں مقدس صلیبی جہاد (Holy War) کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ کیونکہ لوئی نہم نے مشرق پر محض دینی جذبہ اور مذہبی جوش کے ماتحت چڑھائی کی تھی، اور اس کا مقصد وحید مقدس علاقوں کو مسلمانوں کے پنجے سے چھڑا کر مسیحیت کے جھنڈے کو بلند کرنا تھا۔ اس کے پیشرو صلیبی جنگجو ارضِ مشرق پر صرف دینی جذبہ کی بناء پر حملہ آور نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ اس لیے بھی کہ اموال اور قیدیوں سے اپنے آپ کو مالا مال کر لیں اور وہاں کے سرسبز اور شاداب خطوں میں اپنی مملکت قائم کریں — ان مؤرخین نے لوئی نہم کی سیرت اور کردار کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ ایک نہایت پرہیزگار، بے لوث، درویش صفت، عبادت گزار اور نیک طینت بادشاہ تھا جس کا دل دینِ مسیحی کی محبت کے جذبہ سے معمور تھا

میدانِ جنگ میں وہ شجاعت کا پیکر بن جاتا تھا اور مصیبت کے وقت صبر و استقامت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ چنانچہ عیسائی اس کو آج تک سینٹ لوئی (بزرگ یا مقدس لوئی) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مصر پر حملہ آور ہونے سے لوئی کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک پر قبضہ کرنے کے بعد بیت المقدس اور فلسطین و شام کے دوسرے مقدس مقامات پر قبضہ کرنے میں کوئی طاقت اس کی مزاحم نہ ہو سکے گی کیونکہ اس زمانے میں مصر ہی اسلامی اقتدار کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

شاہ لوئی ایک جرّار لشکر کے ساتھ مصر کی طرف بڑھا اور دمیاط کے اہم شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اس زمانے میں ملک صالح سخت بیمار تھا۔ اس لیے وہ مؤثر طور پر صلیبیوں کی مزاحمت نہ کر سکا اور انہوں نے ۲۲ صفر ۶۴۷ھ کو دمیاط پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۶۴۷ھ کو ملک صالح نے منصورہ کے مقام پر پیکِ اجل کو لبیک کہا۔

معرکۂ منصورہ

اپنی وفات سے پہلے ملک صالح صلیبیوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی مقصد کے لیے وہ مملوکوں کی ایک زبردست فوج کے ساتھ منصورہ آیا تھا۔ سلطان کی علالت کے پیشِ نظر اس کی ملکہ شجرۃ الدّر بھی اس کے ساتھ منصورہ میں مقیم تھی۔ وہ ایک نہایت زیرک بلند حوصلہ اور شجاع خاتون تھی اس نے اپنے شوہر کی موت کو بربنائے مصلحت مخفی رکھا اور اس کے نوجوان بیٹے توران شاہ[1] کو، جو ان دنوں حصن کیفا میں مقیم تھا منصورہ بلا بھیجا لیکن اس

---

[1] توران شاہ ملک صالح کی ایک اور بیوی کے بطن سے تھا اور ملکہ شجرۃ الدّر کا سوتیلا بیٹا تھا۔

سے پہلے کہ توران شاہ منصورہ پہنچتا، صلیبی فوجیں دمیاط سے نکل کر منصورہ پہنچ گئیں اور مسلمانوں سے لڑائی چھیڑ دی۔

منصورہ کا مردِ میدان

مملوک فوج پہلے ہی صلیبیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بیتاب ہو رہی تھی اس نے ملکہ شجرۃ الدر کی قیادت میں صلیبی لشکر کا تیروں، تلواروں اور نیزوں سے ایسا "پرجوش" استقبال کیا، جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اس موقع پر مملوک فوج کے ایک نوجوان افسر نے شجاعت اور جانبازی کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ ایک عربی گھوڑے پر سوار وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ نیزہ ہلاتا صلیبی لشکر میں گھس گیا اور ہر طرف لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ صلیبی جنگ جو گروہ در گروہ اس کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ ہر بار ان کی صفوں کو درہم برہم کرتا ہوا دوسری طرف نکل جاتا تھا اور وہاں بھی اپنے جانبازانہ حملوں سے تہلکہ برپا کر دیتا تھا۔ یہ شہسوار ملک صالح کا غلام بیبرس بندقدار تھا۔ منصورہ کی جنگ میں اس نے اپنی عسکری صلاحیتوں اور تہور و شجاعت کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا کہ سب مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا کئی دن تک صلیبیوں اور مسلمانوں میں خوفناک جھڑپیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ صلیبی فوجیں سخت پریشان حالی میں مبتلا ہو گئیں تاہم شاہ لوئی کی موجودگی سے ان کی ہمت بندھی رہی۔

توران شاہ کی آمد

اسی اثنا میں توران شاہ بھی اپنی فوج کے ساتھ منصورہ پہنچ گیا اور مسلمانوں کی قوت دوچند ہو گئی۔ توران شاہ کے پہنچنے پر ملک صالح کی موت کا اعلان کر دیا گیا

اور مملوک امراء نے اس کو ملک معظم کا خطاب دے کر تخت پر بٹھایا۔ توران شاہ نے اس موقع پر بڑی عاقبت نا اندیشی سے کام لیا اس نے بہت سے مصری حاکموں اور امیروں کو جو "ممالیک بحری" سے تعلق رکھتے تھے، معزول کر دیا اور ان کی جگہ "برجی مملوکوں" کو مقرر کیا جو اس کے ساتھ "حصن کیفا" سے آئے تھے۔ اس پر ممالیک بحری ناراض ہو گئے تاہم انہوں نے اس وقت جبکہ صلیبی فوجیں ان کے سامنے پرے باندھے کھڑی تھیں کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا مناسب نہ سمجھا۔

صلیبیوں کی عبرت ناک شکست

ادھر جب شاہ لوئی نے دیکھا کہ مسلمانوں کے مقابلے میں کامیابی محال ہے تو اس نے اپنے لشکر کو دمیاط کی شمالی جانب ہٹ جانے کا حکم دیا۔ چنانچہ صلیبی لشکر نے ۲ محرم ۶۴۸ھ (۵ اپریل ۱۲۵۰ء) کو شام کے وقت منظم طریقے سے پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مسلمان ان کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھ رہے تھے اور انہوں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ صلیبیوں کو یہاں سے بچ کر نہیں نکلنے دیں گے۔ چنانچہ صلیبیوں نے جونہی کوچ کی تیاری کی مسلمانوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ صلیبیوں کے لیے اب "جائے رفتن نہ پائے ماندن" والا معاملہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے جان توڑ کر لڑے لیکن مسلمانوں کے پرجوش حملوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی۔ مملوکوں کے ایک برق رفتار دستے نے جس کی قیادت امیر بیبرس بندقدار کر رہا تھا، آناً فاناً صلیبی لشکر کا قلب توڑ کر رکھ دیا اور شاہ لوئی اور اس کے کئی سرداروں کو عین میدان جنگ میں گرفتار کر لیا۔ اس طرح ساتویں صلیبی جنگ عیسائیوں کی ذلت انگیز شکست پر ختم ہو گئی۔

عرب مورخین کے بیان کے مطابق اس جنگ میں صلیبی مقتولوں، زخمیوں اور

قیدیوں کی تعداد پچاس ہزار کے لگ بھگ تھی اور ان کے مال و اسباب کے نقصان کا تو کوئی حساب ہی نہ تھا۔

مسلمانوں نے شاہ لوئی اور اس کے سرداروں سے فراخدلانہ سلوک کیا۔ وہ چاہتے تو ان کو نہایت آسانی سے قتل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے قابو میں آئے ہوئے دشمن کو محض نظر بند کرنے پر اکتفا کیا۔ ایک روایت کے مطابق ان "معزز" قیدیوں کو منصورہ میں امیر فخر الدین بن لقمان کے گھر میں رکھا گیا اور ان کی خدمت پر ایک ہمہ وقتی خادم صبیح المعظمی کو مقرر کر دیا گیا۔

توران شاہ کا قتل

منصورہ کی جنگ ختم ہوتے ہی توران شاہ کے خلاف بحری مملوکوں کی ناراضی کا لاوا پھوٹ پڑا اور انہوں نے سلطان کے ذاتی محافظوں کو اپنے ساتھ ملا کر اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ایک فرانسیسی مورخ دی جان ویل نے جو شاہ لوئی کے ساتھ مصر گیا تھا۔ اور پھر اس کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا تھا، توران شاہ کو اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے شاہ لوئی کے سوانح حیات میں اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کے بیان کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ایک دن بادشاہ کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کے محافظ دستے کے ایک سپاہی نے تلوار سے وار کر کے اس کو شدید زخمی کر دیا۔ بادشاہ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ بھاگ کر دمیاط میں جا داخل ہوا اور وہاں ایک برج میں پناہ لی۔ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے پانچ سو مملوکوں نے اس برج کو گھیر لیا اور نفط کی پچکاریاں پھینک کر اس کو آگ لگا دی۔ بادشاہ ایک کمند کے ذریعے برج سے

اترا اور دریا کی طرف بھاگا۔ ایک مملوک نے اس کا پیچھا کیا اور اپنا نیزہ
اس کی پسلیوں میں گھونپ دیا۔ بادشاہ کے جسم سے خون کے فوارے
چھوٹنے لگے۔ اسی حالت میں اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی
لیکن مملوک سپاہی اس کو پانی سے باہر کھینچ لائے اور اس جگہ کے قریب
جہاں شاہ لوئی محبوس تھا اس کو قتل کر دیا۔"

بادشاہ کے قتل میں جن لوگوں نے براہ راست حصہ لیا اُن میں امیر
فارس الدین اقطائی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ بحری مملوکوں میں بڑا اثر اور
رسوخ رکھتا تھا اور منصورہ کے مرد میدان امیر بیبرس بندقدار سے اس کے گہرے
دوستانہ تعلقات تھے۔

ملکہ شجرۃ الدُّر

توران شاہ کے قتل کے بعد ۱۰ صفر ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء کو بحری مملوکوں نے ملکہ
شجرۃ الدُّر کو المستعصمیہ الصالحیہ الملکۃ المسلمین عصمت الدنیا و الدین ام الملک المنصور
خلیل کا خطاب دے کر مصر کے تخت حکومت پر بٹھا دیا۔[1]

ملکہ شجرۃ الدُّر کے سامنے سب سے پہلے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ شاہ لوئی اور اس
کے ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ مملوک امراء کے مشورہ سے اس نے
شاہ لوئی کو پیغام بھیجا کہ اگر صلیبی سرزمین مصر سے فوراً نکل جانے کا عہد کریں اور اس
کے ساتھ تاوان جنگ اور فدیہ کے طور پر ایک خطیر رقم حکومت مصر کو ادا کریں تو

---

[1] شجرۃ الدُّر پہلے ایک کنیز تھی بعد میں ملک صالح نے اس کو اپنی ملکہ بنا لیا تھا۔ اس کا ایک لڑکا خلیل
چھ سال کی عمر کا ہو کر فوت ہو گیا تھا اسی کی نسبت سے اس کی کنیت "ام خلیل" تھی۔

بادشاہ سمیت تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ شاہ لوئی نے یہ شرطیں بلا تامل قبول کر لیں۔ چنانچہ ڈیڑھ ماہ کی قید کے بعد شاہ فرانس کو صفر ۶۴۸ھ (مئی ۱۲۵۰ء) میں رہا کر دیا گیا اور وہ اپنے شکست خوردہ سپاہیوں اور امیروں کے ساتھ ارضِ مصر پر حسرت کی نظر ڈالتا ہوا سمندر کے راستے عکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔[1] اس موقع پر جمال الدین بن مطروح نائب دمشق نے چند یادگار طنزیہ اشعار کہے جن کو مسلمان مزے لے لے کر پڑھتے تھے۔ جمال الدین نے ان اشعار میں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی یوں کی تھی:

"جب تو شاہِ فرانس کے پاس جائے تو یہ سچی بات اس کے گوش گزار کر دے کہ یسوع مسیح کے جس قدر پرستار قتل ہوئے ان کے لیے تو خدا سے اجر پائے گا۔ تو مصر کے فتح کرنے کے ارادے سے مصر آیا اور یہ گمان کیا کہ مصری کچے چنے ہیں۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا کہ مصریوں نے تیرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں جن سے یہ کشادہ فضا تیری آنکھوں میں تیرہ و تنگ ہو گئی تو نے اپنے تمام ساتھیوں کو اپنی بدتدبیری سے تباہی کے گھاٹ اتار دیا۔ جن میں سے پچاس ہزار یا تو مارے گئے یا قیدیا زخمی ہو گئے۔ تو اپنے ساتھیوں سے کہہ دے کہ انتقام

---

[1] اس ذلت انگیز پسپائی کے بعد لوئی کو پورے چار سال تک اپنے اہلِ وطن کو منہ دکھانے کی ہمت نہ پڑی اور اس نے یہ عرصہ شام کے صلیبی مقبوضات صیدا، قیساریہ، یافا اور عکہ میں گزارا جن دنوں وہ عکہ میں مقیم تھا شام کے نام نہاد باطنی (حشیشی) مسلمانوں نے اس کے پاس ایک دوستانہ سفارت بھیجی جس نے عیسائی بادشاہ کو کئی تحائف پیش کیے اور اس کو یقین دلایا کہ باطنی اور مسیحی "یک جان دو قالب" ہیں۔ لوئی نے بھی اس سفارت کے ہاتھ باطنیوں کے پیشوا کے لیے کئی تحائف بھیجے۔ شاہ لوئی اگست ۱۲۴۸ء میں فرانس سے نکلا تھا اور جولائی ۱۲۵۴ء میں فرانس واپس گیا اپنی اس چھ سالہ مہم میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں ذلت اور نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکا۔

لینے یا کسی برے ارادے سے وہ دوبارہ ادھر کا رخ کریں تو ابن لقمان کا گھر ابھی موجود ہے اور خوبصورت بیڑیاں بھی محفوظ ہیں۔

اسّی (۸۰) دن کی بادشاہت

ملکہ شجرۃُ الدّر اسّی دن تک مصر پہ بلا شرکت غیرے حکمران رہی اس دوران میں اُس نے غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور کاروبارِ حکومت کو نہایت عمدگی سے چلایا لیکن عباسی خلیفہ بغداد المستعصم باللہ نے عورت کی حکومت کو پسند نہ کیا اور مملوک سرداروں کو پیغام بھیجا کہ کسی مرد کو اپنا حاکم بنائیں۔ چنانچہ مملوک بحری نے جمادی الاول ۶۴۸ھ (اگست ۱۲۵۰ء) میں ملکہ شجرۃ الدّر کو معزول کر دیا اور اتابک العساکر (سپہ سالار) معزالدین ایبک[1] کو ایوبی خاندان کے ایک نوعمر شہزادے الملک الاشرف موسیٰ کا شریک کار بنا کر تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ شجرۃ الدّر نے باختلاف روایت اسی سال یعنی ۶۴۸ھ/۱۲۵۰ء میں یا ۶۵۲ھ/۱۲۵۴ء میں معزالدین ایبک سے نکاح کر لیا۔

---

[1] بعض مؤرخین نے اس کا نام عزالدین ایبک لکھا ہے۔

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

مملوکوں کی فرماں روائی

(دولتِ ممالیک بحری)

معزالدین ایبک اور الملک الاشرف موسیٰ کی مشترکہ حکومت چار سال تک چلتی رہی۔ اس دوران میں الناصر صلاح الدین یوسف[1] ثانی والیٔ حلب و دمشق نے مصر پر دو دفعہ لشکر کشی کی۔ پہلی مرتبہ اس نے بیس ہزار فوج روانہ کی بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق اس میں بہت سے صلیبی بھی شامل تھے۔ الناصر اور صلیبیوں کی اس متحدہ فوج کو مصریوں نے غزہ کے قریب شکست فاش دی۔ کہا جاتا ہے کہ منصورہ کے مرد میدان امیر بیبرس نے اس لڑائی میں بھی بے مثال شجاعت دکھائی اور اہلِ مصر کی نظروں میں بڑا اونچا مقام حاصل کر لیا۔ دوسری مرتبہ الناصر خود دمشق سے ایک جرار لشکر لے کر مصر پر حملہ آور ہوا لیکن ایبک اور اس کے سپہ سالار فارس الدین اقطائی نے اس کو بھی شکست دے کر پسپا کر دیا۔ اس موقع پر خلیفۂ بغداد نے مداخلت کی۔ اور الناصر اور ایبک کے مابین صلح کرا دی جس کی رُو سے مصر کی حکومت دریائے اردن تک تسلیم کر لی گئی۔ اور فریقین نے عہد کیا کہ آئندہ صلیبیوں کے مقابلے میں متحد رہیں گے۔

۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء میں الملک الاشرف موسیٰ پوشیدہ طور پر یمن چلا گیا اور پھر واپس نہ آیا۔ دیگر

---

[1] یہ سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس کا پڑپوتا تھا۔

خود ایبک نے اس کو یمن بھیج دیا، جہاں اس کے کئی رشتہ دار موجود تھے۔)

الملک الاشرف موسیٰ ایوبی خاندان کا آخری حکمران تھا جن کے نام کا خطبہ میں پڑھا گیا اس کے بعد وہاں خالص مملوک حکومت قائم ہو گئی۔ اور پہلے بحری اور پھر برجی مملوکوں نے مجموعی طور پر پونے تین سو سال تک اس شان سے حکمرانی کی کہ مشرق و مغرب کا کوئی حکمران ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔

الملک المعز (جاشنگیر)

معزالدین ایبک کا تعلق بحری مملوکوں سے تھا۔ مسند حکومت پر بیٹھنے کے بعد اس نے الملک المعز (جاشنگیر) کا لقب اختیار کر لیا تھا اور اپنی داد و دہش سے مملوک فوج کو مکمل طور پر اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ تاہم اس کو زیادہ عرصہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا کیونکہ ملکہ شجرۃ الدرّ نے اس کو $\frac{655}{1257}$ھ میں قتل کرا دیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ملک معز نے بدرالدین امیر موصل کی بیٹی شہزادی لؤلؤ سے نکاح کر لیا۔ اس پر شجرۃ الدرّ سخت ناراض ہوئی اور ایک دن جب معز حمام میں غسل کر رہا تھا، ملکہ نے اپنی لونڈیوں کے ذریعہ اس کا رشتۂ حیات منقطع کرا دیا۔ جونہی یہ خبر ملکہ لؤلؤ اور مملوک امراء کو معلوم ہوئی وہ سخت غضب ناک ہوئے اور شجرۃ الدرّ کو قلعۂ قاہرہ کے قید خانے میں ڈال دیا۔ ملکہ لؤلؤ کے اشارے سے اس کی چند لونڈیاں قید خانے میں گئیں اور لکڑی کے جوتوں سے مار مار کر شجرۃ الدرّ کا بھیجا نکال دیا اور اس کی لاش قلعہ کے نیچے خندق میں پھینک دی۔ مملوک امراء نے اس کے قتل پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ تاہم انہوں نے مقتول ملکہ کی لاش کو بے گور و کفن نہ پڑا رہنے دیا اور اسی کی تعمیر کردہ ایک مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا۔

الملک المنصور نور الدین

ملک معز جاشنگیر نے ایک پندرہ سالہ لڑکا چھوڑا تھا جس کا نام نور الدین علی ایبک تھا۔ مملوک امراء نے اس کو الملک المنصور کا لقب دے کر تخت حکومت پر بٹھا دیا اور سیف الدین محمود قطوزی (قوطوز یا قطز) کو اس کا اتابک اور نگراں سلطنت مقرر کیا۔[1]

ملک منصور کے عہد میں وحشی تاتاریوں کی یورش جس نے تقریباً چالیس سال سے عالم اسلام میں تہلکہ مچا رکھا تھا اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی اور مرکز خلافت بغداد کو پامال کرنے کے بعد اس کی طوفانی لہریں شام اور مصر سے ٹکرانے لگیں۔ یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم فتنۂ تاتار پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیں تاکہ اس کی قیامت خیزیوں کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکے۔

---

[1] سیف الدین محمود قطوزی کا تعلق خیوا کے خوارزم شاہی خاندان سے تھا۔ وہ جلال الدین خوارزم شاہ کا بھانجا تھا اور تاتاریوں کے ہاتھوں خوارزم شاہی سلطنت کی بربادی کے بعد مصر آ گیا تھا۔ یہاں اس کو معز جاشنگیر نے اپنا معتمد خاص بنا لیا تھا۔

فتنۂ تاتار (پہلا دور)

تاتاری یا مغل (مغول) منگولیا کے وسیع صحرائی میدانوں کے رہنے والے ارواح پرست وحشی قبائل تھے۔ صحرا کی خانہ بدوشانہ زندگی نے ان کو بیحد جفاکش جنگ جُو اور نڈر بنا دیا تھا۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے مؤرخ عبداللطیف کے حوالے سے تاتاریوں کے خصائل و عادات کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اُن لوگوں کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑتی تھیں اور شمشیر زنی اور تیر اندازی میں کسی طرح اپنے مردوں سے کم نہ ہوتی تھیں۔ وہ جس چیز کا گوشت مل جاتا رغبت سے کھا جاتے تھے اور کسی چیز سے پرہیز نہیں کرتے تھے ان کے قتل و غارت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ عورتوں اور بچوں کو بھی بے دریغ قتل کر دیتے تھے۔ نہ وہ موت سے ڈرتے تھے اور نہ دوسروں پر رحم کرتے تھے۔ وہ مشکوں پر یا گھوڑے کی ایال یا دُم پکڑ کر تیرتے ہوئے دریاؤں کو عبور کر جاتے تھے۔"

تاتاریوں کی باقاعدہ تاریخ کا آغاز چھٹی صدی ہجری (بارھویں صدی عیسوی) کے اخیر میں اس وقت ہُوا جب ان کے تمام قبائل کو چنگیز خاں نے ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور پھر ان کو ساتھ لے کر تاتار اور چین کے وسیع علاقے فتح کر لیے۔ ممالک اسلامی پر تاتاریوں کی لرزہ خیز یورش کا آغاز ۶۱۵ھ/۱۲۱۸ء میں ہُوا۔ اسی یورش کو مسلمان مؤرخین نے "فتنۂ تاتار" سے موسوم کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ تو چنگیز خاں کی ہوسِ ملک گیری اور روئے زمین کے کل انسانوں کا شہنشاہ بننے کی خواہش تھی لیکن بظاہر

علاؤالدین محمد خوارزم شاہ اور چنگیز خاں کی باہمی نزاع اس یورش کی محرک ہوئی[1]۔

دولتِ خوارزم شاہی

خوارزم شاہی سلطنت کا بانی سلجوقیوں کا ایک سردار اتسز (۵۲۱ھ/۱۱۲۷ء تا ۵۵۱ھ/۱۱۵۶ء) تھا۔ روس کا وہ علاقہ جو آجکل خیوا کے نام سے مشہور ہے اس زمانے میں خوارزم کہلاتا تھا اور اس کے حکمران کا لقب خوارزم شاہ تھا۔ اتسز سلجوقیوں کی طرف سے اس علاقے کا گورنر تھا لیکن بعد میں خود مختار ہو گیا۔ اتسز کے بعد الارسلان (۵۶۸ھ/۱۱۵۶ء تا ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء) سلطان شاہ محمود ۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء تکش (۵۶۸ھ/۱۱۷۲ء تا ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء) یکے بعد دیگرے خوارزم کے تختِ حکومت پر بیٹھے۔ تکش بڑا حوصلہ مند حکمران تھا۔ اس نے خوارزم کے علاوہ خراسان۔ رے اور اصفہان بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیے۔ ۵۹۶ھ/۱۱۹۹ء میں اس نے وفات پائی تو اپنے پیچھے ایک وسیع سلطنت چھوڑی جس پر اس کا بیٹا علاؤالدین محمد حکمران ہوا۔ علاؤالدین محمد بڑے دبدبہ کا بادشاہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سلطنت کو مزید وسعت دی اور بہت سے علاقے فتح کر کے دولتِ خوارزم شاہی کی سرحدیں ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف چنگیز خانی مملکت سے ملا دیں۔ خیوا (ارگنج) سمرقند۔ بلخ۔ بخارا۔ نیشاپور۔ قزوین۔ مرو۔ زنجان ہرات۔ رے۔ اصفہان۔ ہمدان۔ خجند وغیرہ کے مشہور شہر جو مسلمانوں کی تہذیب و

---

[1] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ چنگیز خاں کو خوارزم شاہ پر فوج کشی کرنے کی ترغیب عباسی خلیفہ ناصرالدین اللہ (۵۷۵ھ تا ۶۲۲ھ) نے دی تھی۔ کیونکہ خوارزم شاہ اور اس کے درمیان عرصہ سے ان بن چلی آ رہی تھی۔ اور خلیفہ کو خطرہ تھا۔ کہ کہیں وہ بغداد پر آ کر قبضہ نہ کر لے۔ اگر یہ روایت درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عباسی خلیفہ نے اپنی خلافت کی تباہی کا بیج خود بویا۔ اگر اس کو یہ معلوم ہوتا کہ تاتاری طوفان ایک دن خود عباسی خلافت کو بہا لے جائے گا تو شاید یہ احمقانہ حرکت اس سے سرزد نہ ہوتی۔

و تمدن اور علم و شائستگی کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ خوارزم شاہی سلطنت میں ہی واقع تھے۔ کہا جاتا ہے کہ شروع شروع میں خوارزم شاہی اور چنگیز خانی حکومتوں میں بہت اچھے تعلقات تھے اور دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے تھے لیکن بد قسمتی سے چند سال بعد ایک حادثہ دونوں سلطنتوں میں نزاع کا باعث بن گیا۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ خوارزم شاہ کے ایک سرحدی گورنر نے چند مغل تاجروں کو جاسوس سمجھ کر قتل کر دیا اور ان کا سامانِ تجارت ضبط کر لیا۔ چنگیز خان نے خوارزم شاہ کے پاس ایلچی بھیج کر اس واقعہ پر سخت احتجاج کیا اور اس کے ساتھ ہی مطالبہ کیا کہ مجرم گورنر کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ خوارزم شاہ بڑا خود سر حکمران تھا۔ اس نے غصے میں آ کر چنگیز خان کے ایلچی کو قتل کرا دیا۔ چنگیز خان کو یہ خبر ملنے کی دیر تھی کہ وہ باختلافِ روایت چھ لاکھ یا دس لاکھ تاتاریوں کا ٹڈی دل لے کر خوارزم شاہی سلطنت پر ٹوٹ پڑا۔

خدائی قہر

تاتاریوں کی یلغار کو مسلمان مؤرخین نے خدائی قہر کا نام دیا ہے۔ فی الحقیقت اس کو خدائی قہر کے سوا کسی دوسری چیز سے تشبیہ دینا ممکن بھی نہیں ہے۔ خونخوار تاتاری گروہ در گروہ سیلاب کی طرح خوارزم شاہی سلطنت میں گھس گئے اور انہوں نے بخارا۔ سمرقند۔ بلخ۔ نیشاپور۔ ہرات۔ رے۔ قزوین اور دوسرے بڑے شہروں اور قصبوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اور وہاں کے باشندوں کو نہایت بے دردی سے تہِ تیغ کر دیا۔ اس قتلِ عام میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور کسی کی تخصیص نہ تھی۔ جو لوگ کسی طرح قتل ہونے سے بچ گئے، ان کو غلام بنا لیا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے "پریچنگ آف اسلام" (دعوتِ اسلام) میں

"تاتاریوں کی غارت گری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"جب تاتاریوں کے لشکر کسی ملک کو برباد کر کے رخصت ہوتے تو شاہوں کے قصر و ایوان اور عالی شان شہروں کی جگہ جو خوش نما باغوں اور سرسبز مزروعہ زمینوں میں کھڑے تھے مٹی اور پتھر کے تودے نظر آتے ــــ جس وقت ہرات کے شہر سے مغلوں کے لشکر نے کوچ کیا تو چالیس آدمی بدحواس اپنے چھپنے کی جگہ سے نکلے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس برباد ویرانے کو دیکھنے لگے جو کچھ دن پہلے ان کا خوبصورت شہر تھا اور یہی چالیس آدمی تھے جو ایک لاکھ کی آبادی سے بچے تھے[1] بخارا میں جو علمائے اسلام کی بدولت دنیا میں مشہور تھا ان مغلوں نے مسجدوں میں اپنے گھوڑے باندھے اور قرآن پھاڑ پھاڑ کر ان کی بے ادبی کی۔ جن مسلمانوں کو ان ظالموں نے قصائی بن کر ذبح نہیں کیا ان کو غلام بنا کر لے گئے اور شہروں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہی حال سمرقند، بلخ اور وسط ایشیا کے اور شہروں کا ہوا جن سے اسلامی تہذیب و تمدن کی شان تھی اور جو عالموں کا مسکن اور علم کا مخزن تھے"

علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ نے اس سیلاب کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پایا تو بھاگ کھڑا ہوا لیکن جدھر جاتا تاتاری اس کا پیچھا کرتے آخر بھاگتا چھپتا بحیرۂ خزر کے ایک جزیرے میں پہنچا اور سنہ ۶۱۷ھ / ۱۲۲۰ء میں وہاں بڑی

---

[1] سر سید امیر علی کا بیان ہے کہ ہرات کی آبادی دس لاکھ تھی۔ بلخ میں بھی اسی قدر لوگ آباد تھے اور سمرقند و بخارا کی آبادی تو اس سے بھی زیادہ تھی۔

بے سروسامانی کے عالم میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا جلال الدین محمد بڑے دل گردے کا آدمی تھا۔ باپ کے مرتے ہی اس نے اپنے آپ کو تاتاری سفاکوں کے نرغے میں پایا تاہم اس نے نہایت جواں مردی سے ان کا مقابلہ کیا اور دو معرکوں میں انہیں شکست بھی دی لیکن چنگیز خاں طوفانِ بلا کی طرح اس کے پیچھے لگا رہا یہاں تک کہ وہ اپنے وطن کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ تاتاریوں کی یورش صرف خوارزم شاہی سلطنت تک محدود نہ رہی بلکہ اس سے متصل کئی اور اسلامی علاقے اور یورپ کے کئی ملک بھی اس کا ہدف بنے۔

۶۲۴ھ / ۱۲۲۷ء میں چنگیز خاں نے وفات پائی تو اس کی سلطنت اقصائے چین سے عراق بحرِ خزر اور حدودِ روس تک اور بحرِ شمال سے سرحدِ ہند تک پھیل چکی تھی[1]۔

چنگیز خاں کی موت کے بعد جلال الدین محمد نے اپنے آبائی ملک پر پھر قبضہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے لیکن مغلوں کے طوفانِ بدتمیزی کے سامنے اس کی کچھ

---

[1] چنگیز خاں اپنی غارت گری کے باعث مسلمانوں کے نزدیک خواہ کتنا ہی برا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ وہ اپنی قوم کا ہیرو اور ایک بہت بڑا فاتح تھا۔ وہ عسکری تنظیم، تجارت، صنعت و حرفت اور انتظامِ ملکی کی اہمیت کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ تجارت کیلئے سہولتیں پیدا کرتا اور تجارتی قافلوں کے راستوں کی حفاظت کرتا۔ سڑکوں اور پلوں کی مرمت کراتا اور رسل و رسائل میں کوئی رکاوٹ نہ پڑنے دیتا۔ اس نے مفتوح قوموں میں سے بہت سے اہل کار دکلرک) مقرر کیے اور اپنی قوم کے لیے ایک دستور العمل یا آئین بھی مرتب کیا جس کا نام یساق رکھا۔ مغل اس پر صدیوں تک عمل کرتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ یساق کا ایک نسخہ بغداد کے مدرسہ مستنصریہ میں محفوظ تھا۔ علامہ مقریزی نے اس کو دیکھ کر اپنی کتاب "الخطط والآثار" میں اس کا خلاصہ لکھا ہے۔

پیش نہ چلی اور اس کو کردستان کی پہاڑیوں میں پناہ لینی پڑی جہاں ۶۲۸ھ ۱۲۳۱ء میں ایک کرد نے اس کو قتل کر ڈالا۔

فتنۂ تاتار کا دوسرا دور

چنگیز خاں کی وفات کے بعد بھی تاتاریوں کی فتوحات کا سلسلہ زور شور سے جاری رہا اور تیس سال کے عرصے میں انہوں نے روس اور وسط یورپ کے کئی ممالک کو روند ڈالا۔ ۶۵۴ھ ۱۲۵۶ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے ایک جرار لشکر کے ساتھ اسلامی ممالک پر اس ہولناک یلغار کا آغاز کیا جو عباسی خلافت کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گئی ہلاکو خاں نے سب سے پہلے حشاشین یعنی باطنیوں کے علاقے کا رخ کیا اور ان کے مرکز قلعہ الموت اور دوسرے سو قلعوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس کے بعد وہ خراسان کے راستے عباسی دار الخلافت بغداد کی طرف بڑھا۔

سقوطِ بغداد

عروس البلاد بغداد پر تاتاری حملے کے اسباب و عوامل کیا تھے؟ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ مسلمانوں کے تشتت و افتراق اور بے حمیتی نے تاتاری وحشیوں کو قلب اسلام پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ عباسی خلافت جو تین سو سال سے برابر زوال پذیر تھی، انحطاط کے اس دور میں اپنی بقاء کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی سہارے کی محتاج رہتی تھی۔ طاقتور غزنوی۔ سلجوقی۔ زنگی اور ایوبی حکمرانوں کے زوال کے بعد وہ بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔ عباسی خلفاء اگر اس وقت بھی ہوش سے کام لیتے اور اس دور کی دوسری طاقت ور مسلم حکومتوں سے دوستانہ مراسم استوار کر لیتے تو شاید بغداد کی عباسی خلافت کو وہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا جس نے اس کو صفحۂ ہستی سے

حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا لیکن ان خلفاء کی غفلت اور عاقبت نا اندیشی کی یہ کیفیت تھی کہ ان کی سرحدوں سے کچھ دُور اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے سروں پر سے خون کا سیلاب گزر رہا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے اپنے بے کار مشاغل میں مصروف تھے۔ ان کی خوشی اسی میں تھی کہ چار چار سو غلام زرّیں پٹکے باندھے ان کے سامنے دست بستہ حاضر رہیں اور لوگ ان کے تخت کو عرشِ معلّٰے سمجھتے رہیں۔ قدرت نے ان کو بہتیری ڈھیل دی تھی لیکن انہوں نے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا یہاں تک کہ محرم ۶۵۶ھ (جنوری ۱۲۵۸ء) میں ہلاکو قہر الٰہی بن کر بغداد پر آنازل ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ قلبِ اسلام پر حملہ کرنے والے غارت گر تاتاریوں کے لشکر میں سعدی شیرازی کا ممدوح ابوبکر بن سعد زنگی اتابک شیرازؒ اور بدرالدین لُولُو والیٔ موصل بھی اپنی "مسلمان" فوجوں سمیت شامل تھے۔ خلیفہ المستعصم باللہ محصور ہو کر تاتاریوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن چالیس دن کے بعد اس کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی اور اس نے اپنے آپ کو تاتاریوں کے حوالے کر دیا ـــ اس کے بعد بغداد پر جو کچھ بیتی۔ اس کی داستان ناگفتنی ہے۔ ساتویں صدی ہجری کا نامور مؤرخ محمد بن علی بن طبا طبا معروف بہ ابن طقطقی اپنی کتاب "الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ" میں لکھتا ہے کہ بغداد میں ہلاکو کی فوجوں کے داخل ہوتے ہی اس شدت کے ساتھ قتل و غارت جاری ہوا کہ بالاجمال بھی اسے سننا گراں گزرتا ہے چہ جائیکہ تفصیل وار

وکان ما کان مما لست اذکرہ
فظن خیرا ولا تسئل عن الخبر

ؒ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ ابوبکر بن سعد خود اس لشکر میں شریک نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے بیٹے کو فوج دے کر ہلاکو کی مدد کے لیے بھیجا تھا۔

(جو کچھ ہُوا سو ہُوا میں اس کا ذکر نہیں کروں گا بس قیاس سے سمجھ لو اور اصل خبر مت پوچھو۔)

حقیقت یہ ہے کہ بغداد کی عبرت ناک تباہی و بربادی کو احاطۂ تحریر میں لانا اگر ناممکن نہیں تو سخت محال ضرور ہے۔ مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ دارالسلام بغداد جس کا دروازہ صدیوں سے بوسہ گاہِ خلائق رہا تھا وہاں چھ ہفتوں تک زبانِ شمشیر کے سوا کسی اور کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ بیس لاکھ آبادی کے اس عظیم الشان شہر میں آٹھ لاکھ (اور ایک دوسری روایت کے مطابق سترہ لاکھ) آدمی نہایت بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ ان میں عورتیں، بچے، بوڑھے، علماء، فضلاء، اہل ہنر، اساتذہ، طلبا، مریض اور معذور ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ ناز پروردہ اور عصمت مآب خواتین جن پر کبھی کسی غیر مرد کی نظر تک نہیں پڑی تھی، اپنے گھروں سے کشاں کشاں باہر لائی گئیں اور سڑکوں اور چوراہوں پر ان کی بے حرمتی کی گئی اس کے بعد ان مظلوموں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا کنیزیں بنا لیا گیا۔ خلیفہ مستعصم سے جان بخشی کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن چوتھے ہی دن اسے ایک قالین میں لپیٹ کر لاتیں اور گھونسے مار مار کر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ چنگیز خاں کے "یساق" میں یہ لکھا تھا کہ کسی بادشاہ کے خون سے تلوار رنگین نہیں ہونی چاہیئے۔ عباسی شہزادے اور شہزادیاں، خلیفہ کے درباری مصاحب، علماء، فضلاء اور دوسرے اہل کمال بھی جو اس کے ساتھ ہلاکو کی پناہ میں گئے تھے، تلوار کے گھاٹ اتر گئے۔ بغداد کے لاتعداد فلک بوس قصر و ایوان، رفیع الشان مساجد و مدارس، بے نظیر کتب خانے اور شفاخانے، قدیم مقبرے اور مزارات سب یا تو جلا کر راکھ کر دیئے گئے یا ان کو بری طرح برباد کر دیا گیا۔ جاہل تاتاریوں نے علم و ہنر کے وہ نایاب خزانے جو عباسی خلفاء اور اکابر علماء نے اپنے کتب خانوں میں بڑی محنت سے جمع کئے تھے، جلا کر دریا بُرد کر دیئے۔ غرض بغداد اس بری طرح تباہ ہُوا کہ آج تک اس

کی گزشتہ شان و شوکت بحال نہیں ہو سکی۔

بغداد کا مٹنا اور خلیفہ کا قتل ہونا کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا اس سے سارے عالمِ اسلام میں کہرام مچ گیا کیونکہ عباسی خلیفہ کی کمزوری کے باوجود اسے روحانی طور پر ساری اسلامی دنیا کا فرماں روا سمجھا جاتا تھا اور بڑے بڑے باجبروت مسلم حکمران اور فاتح اس کے سامنے گردنیں جھکاتے تھے اور اس سے خلعت اور سند حاصل کرنا اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔ اس زمانے کے شاعروں نے اس سانحہ پر ایسے ایسے دلدوز مرثیے لکھے ہیں کہ انہیں پڑھ کر کلیجہ شق ہوتا ہے۔ شیخ سعدی شیرازیؒ نے بھی اس جانکاہ حادثہ سے متاثر ہو کر ایک دردناک مرثیہ لکھا جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ شیخؒ نے کاغذ پر خون کے آنسو ٹپکائے ہیں لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ شیخؒ نے اسی مرثیہ کے آخر میں ابوبکر بن سعد زنگی کی تعریف و توصیف بھی کی ہے حالانکہ اس نے ہلاکو خاں کا پورا پورا ساتھ دیا تھا بہر صورت یہ مرثیہ اپنی تاثیر اور زورِ بیان کے لحاظ سے فارسی زبان کے نادر شہ پاروں میں شمار ہوتا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے چند اشعار یہاں درج کر دیں۔

سعدی کے مرثیۂ بغداد (فارسی) کے چند اشعار

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں

(آسمان کو سزاوار ہے کہ امیر المومنین مستعصم کی تباہی پر زمین پہ خون برسائے)

اے محمدؐ گر قیامت می برآری سر ز خاک
سر برآور دین قیامت درمیانِ خلق بیں

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر آپ قیامت ہی کو مرقد اقدس سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت دنیا میں دیکھ لیجئے۔)

نازنینانِ حرم راخونِ حلقِ نازنیں
زآستاں بگذشت و ماراخونِ دل از آستیں

(محل کے ناز پروردوں کے حلق کا خون ڈیوڑھی سے بہہ گیا اور ہمارے دل کا خون آستین سے ٹپک نکلا)۔

زینہار از دورِ گیتی و انقلابِ روزگار
در خیالِ کس نگشتے کآنچناں گردد چنیں

(زمانہ کی گردش اور دنیا کے انقلاب سے پناہ مانگنی چاہیئے یہ بات کسی کے خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ یوں سے یوں ہو جائے گا۔)

دیدہ بردار ایکہ دیدی شوکتِ بیت الحرام
قیصرانِ روم سر برخاک و خاقاں بر زمیں

(اے وہ کہ جس نے اس بیت الحرام کی شان و شوکت دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے خاقان خاک پر سر رگڑتے اور زمین پر بیٹھتے تھے، ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھ۔

خونِ فرزندانِ عمِ مصطفےٰ ؐ شد ریختہ
ہم برآں خاکے کہ سلطاناں نہادندے جبیں

(محمد مصطفےٰ ؐ کے چچا کے فرزندوں کا خون اس خاک پر بہہ گیا جہاں سلاطین ماتھا رگڑتے تھے)۔

دجلہ خونابست زیں پس گر نہد سر در نشیب
خاکِ نخلستانِ بطحا را کند باخوں عجیں

(دجلہ کا پانی نکتہ خون ہو گیا ہے اگر اب جاری رہے گا تو نخلستان بطحا کی خاک کو خون سے رنگین کر دے گا)۔

باش تا فردا کہ بینی روز داورِ رستخیز
کز لحد با روئے خوں آلودہ برخیزد فلیں

(کل تک صبر کرو قیامت کے دن دیکھ لینا کہ قبر سے اہل قبر لہو بھرا منہ لے کر اٹھیں گے)۔

اس فارسی مرثیہ کے علاوہ شیخ سعدیؒ نے نوّے (۹۰) اشعار سے بھی زائد کا ایک مرثیہ عربی زبان میں لکھا ہے جو دلوں کو نہیں بلکہ پتھروں کو بھی پگھلا دیتا ہے اس مرثیہ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

نَسِیمُ صَبَا بَغْدَادَ بَعْدَ خَرَابِھَا
تَمَنَّیْتُ لَوْ کَانَتْ تَمُرُّ عَلٰی قَبْرِیْ

(کاش ایسا ہوتا کہ بغداد کی تباہی کے بعد اس کی ہوا کا جھونکا میری قبر پر گزرتا یعنی یہ حادثہ میں اپنی زندگی میں نہ دیکھتا)۔

ولا تسألن عمّا جرای یوم حصرھم
وذالك مما لیس یدخل فی الحصر

(نہ پوچھو جو حال بنی عباس کی قید کے دن گزرا یہ وہ حال ہے جو قید بیان میں نہیں آسکتا)۔

اُدِیرَتْ کُؤُوسُ الموت حتّٰی کَانَّہٗ
رُؤُسُ الاسارٰی تحرکنّ مِنَ السُّکْرِ

(شرابِ مرگ کے جام گردش میں لائے گئے یہاں تک کہ قیدی مقتولوں

کے سر (تڑپتے ہوئے) ایسے معلوم ہوتے تھے گویا نشے میں جھوم رہے ہیں)۔

بکت جدر المستنصریۃ ندبۃً
علی العلماء الرّاسخین ذوالحجر

(علمائے راسخین پر جو اصحاب عقل و دانش تھے مدرسہ مستنصریہ کی دیواریں زار زار رو رہی ہیں)

نوائبُ دھرٍ لیتنی متُّ قبلھا
ولم ارعد وان السفیہ علی الحبر

(یہ زمانے کے سخت حادثے ہیں کاش! میں ان سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم دانش مندوں پر نہ دیکھتا۔)

فاین بنو العباس مفتخر الوریٰ
ذو والخلق المرضیٰ والغرر الزھر

(کہاں ہیں بنی عبّاس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے اخلاق برگزیدہ اور پیشانیاں نورانی تھیں)۔

غدًا اسمرًا بین الانام حدیثھم
وذا سمرٍ یدمی المسامع کالسُّمر

(ان کا ذکر اب دنیا میں ایک افسانہ ہو گیا اور یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو برچھیوں کی نوک کی طرح خون آلودہ کرتا ہے)۔

ومستصرخٍ یا للمروّۃ فانصروا
ومن یصرخ العصفور بین یدی صُقر

(بہت سے فریاد کرتے تھے کہ دہائی ہے مروّت کی کوئی مدد کرو مگر باز

کے پنجے میں چڑیا کی فریاد کو کون پہنچتا ہے)۔

یساقون سوق المعز فی کبد الفلا
عزائز قوم لا یعودون بالزّجر

(جو لوگ زجر اور دھمکی سننے کے عادی نہ تھے ان کی مستورات صحرا میں بکریوں کی طرح ہنکائی جاتی تھیں۔)

بجلین سبایا سافرات وجوھھا
کواعب لا تبرزن من حلل الخدام

(جو لڑکیاں پردہ میں چادروں سے پھرے باہر نہ نکالتی تھیں ان کو کھلے منہ اسیر کر کے لے گئے)۔

مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

بغداد کو تاراج کرنے کے تقریباً دو سال بعد صفر ۶۵۸ھ (جنوری ۱۲۶۰ء) میں ہلاکو کی فوجیں عراق کے دوسرے شہروں کی طرف بڑھیں۔ تباہی و بربادی۔ خونریزی اور جہالت ان کی جلو میں تھی۔ چند دن کے اندر اندر انہوں نے الرہا (عدلیسہ) نصیبین اور حرّان کے بارونق شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور وہاں کے باشندوں کو نہایت بیدردی سے قتل کر دیا۔ حرّان نے اس شرط پر اطاعت قبول کی تھی کہ شہر محفوظ رکھا جائے گا۔ لیکن وحشی تاتاریوں نے شہر پر قبضہ کرتے ہی قتلِ عام شروع کر دیا حتےٰ کہ ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹے ہوئے شیر خوار بچوّں کو بھی نہ چھوڑا۔ یہاں سے تباہی و بربادی کا یہ جھکّڑ شام میں داخل ہوا اور حلب۔ حماۃ۔ بعلبک اور صیدا کو بری طرح پامال کر ڈالا۔ حلب کے پچاس ہزار باشندے موت کے گھاٹ اتر گئے اور اس کی عظیم الشان جامع مسجد کو آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح حماۃ۔ بعلبک اور صیدا کھنڈروں کے ڈھیر

ہ گئے۔ تاتاریوں کا ایک لشکر کا دا کا منا ہوا دمشق میں جا گھسا۔ اس کے ساتھ انطاکیہ کے صلیبی نائٹ اور ان کا سردار ریمنڈ چہارم۔ گرجستانی اور ارمنی عیسائی بھی تھے۔ دمشق پر قابض ہو کر ان لوگوں نے شہر کو خوب لوٹا۔ اس کے بعد تاتاریوں کے سیلِ بلا نے فلسطین کا رخ کیا۔

تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ

اوپر کی سطور میں اسلامی ملکوں پر تاتاریوں کی یلغار کا محض ایک سرسری خاکہ پیش کیا گیا ہے اگر اس کی تفصیل لکھی جائے تو اس کے لیے کئی دفتر درکار ہوں گے سر تھامس آرنلڈ کا بیان ہے کہ:

"اسلامی تاریخ میں کوئی واقعہ ایسی سفاکی اور غارت گری کا نہیں ہے جس کا مقابلہ تاتاری یورش سے کیا جائے۔"

لیکن نامور مسلم مؤرخ علامہ ابن اثیر نے اس کو صرف اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ قرار دیا ہے وہ فتنۂ تاتار کا حال قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"میں کئی برس تک اس حادثۂ عظیم کے تلخ ذکر کو بیان کرنے سے ہچکچاتا رہا کیونکہ کون ایسا شخص ہوگا جو اسلام کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کی داستان لکھے اور اس کے لیے اس کا بیان کرنا آسان ہو۔ کاش میری ماں مجھ کو نہ جنتی اور میں اس سے پہلے ہی مر جاتا اور دنیا مجھ کو بالکل بھول جاتی مگر اس حال میں کہ میں اس حادثہ کا ذکر کرنے میں تامّل کرتا تھا مجھ کو چند دوستوں نے اس کو قلم بند کرنے پر مجبور کیا ــــ اب میں کہتا ہوں کہ میرا کام ایسے بڑے حادثہ اور ایسی سخت مصیبت

کے بیان کرنے کا ہے جس کی نظیر لیل و نہار نہیں لا سکتے اور یہ مصیبت عموماً تمام لوگوں پر اور بالخصوص مسلمانوں پر نازل ہوئی اگر کوئی کہے کہ جب سے خدا نے آدم کو پیدا کیا اس وقت سے آج تک دنیا ایسی مصیبت میں مبتلا نہیں ہوئی تو وہ بالکل سچا ہے کیونکہ تاریخ میں کوئی حادثہ اور کوئی واقعہ موجود نہیں ہے جو اس کے لگ بھگ ہو۔ سب سے بڑا حادثہ جو تاریخ میں ملتا ہے وہ بخت نصر کا ظلم و ستم ہے جس نے بنی اسرائیل کو قتل کیا اور بیت المقدس کو برباد کیا مگر بیت المقدس کی ان شہروں کے مقابلے میں کیا حقیقت ہے جن کو ان ملعون تاتاریوں نے برباد کیا اور جن میں سے ہر شہر بیت المقدس سے کئی گنا تھا اور بنی اسرائیل کی ان لوگوں کے مقابلے میں کیا حقیقت ہے جن کو انھوں نے قتل کیا کیونکہ تاتاریوں نے جن شہروں میں قتل عام کیا ان سے تنہا ایک شہر کے باشندے شمار میں بنی اسرائیل سے زیادہ ہیں ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ انھوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے قتل کیا عورتوں کے پیٹ چاک کیے اور شیر خوار بچوں کو ان کی ماؤں سے چھین کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ٥ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ ٥"

مصر بیدار ہوتا ہے

پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ جس زمانے میں عراق اور شام میں یہ لرزہ خیز واقعات ہو رہے تھے مصر میں مملوکوں کی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ سقوطِ بغداد کے

وقت مصر پر پندرہ سالہ ملک المنصور حکمران تھا۔ اہلِ مصر تاتاریوں کی غارت گری کی خبریں مدت سے سُن رہے تھے لیکن دوسرے ملکوں کے مصیبت زدہ مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے ان میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی تھی شاید اس لیے کہ وہ تاتاری طوفان کو مصر سے دور اور اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے یا اس لیے کہ وہ اپنے اندر تاتاریوں سے ٹکر لینے کی سکت ہی نہ پاتے تھے۔ لیکن آخران کا یہ جمود ٹوٹ گیا — بغداد کی تباہی اور خلیفہ کے قتل کی خبر ان پر بجلی بن کر گری اور جب تاتاریوں کے مفتوحہ علاقوں سے مسلمانوں کے لُٹے پُٹے قافلے پناہ لینے کے لیے مصر میں داخل ہونے شروع ہوئے تو اہلِ مصر میں سخت ہیجان برپا ہوگیا۔ جب وہ تارکینِ وطن کی زبانی تاتاریوں کے ظلم و ستم کے واقعات سنتے تھے تو ان کا خون کھول اٹھتا تھا۔ اب وہ شدت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ خطرہ ان کے قریب آپہنچا ہے اور اگر وہ اس کے مقابلے کے لیے تیار نہ ہوئے تو اُن کا وہی حشر ہوگا جو اہلِ بغداد کا ہو چکا ہے۔

ملک مظفّر سیفُ الدّین

دہشت اور ہیجان کی اسی فضا میں ملک منصور کے اتابک سیف الدین قطوزی (قطز) نے علماء اور عمائدِ سلطنت کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ یہ بڑا نازک وقت ہے تاتاریوں نے مرکزِ خلافت کو برباد کر ڈالا ہے اور خلیفہ کو شہید کر دیا ہے کوئی تعجب نہیں کہ اب وہ مصر کا رخ کریں۔ بادشاہ ابھی بچّہ ہے اور دن بھر غلاموں کے ساتھ کبوتر اڑانے کے سوا کچھ نہیں جانتا اس وقت ہمیں کسی ایسے حکمران کی ضرورت ہے جو صاحبِ سیف بھی ہو اور صاحبِ تدبیر بھی — تمام عُلماء اور اُمراء نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ ہم آپ سے بڑھ کر کوئی اور مسندِ حکومت کے لائق نہیں سمجھتے — چنانچہ ملک منصور کو معزول کرنے کے بعد سب نے قطوزی (قطز) کے ہاتھ

پر بیعت کر لی اور وہ شوال ۶۵۷ھ / ۱۲۵۹ء میں مصر کا حکمران بن گیا۔ تخت نشینی کے بعد
اس نے الملک المظفرؒ کا لقب اختیار کیا۔

تاتاری مصر کی طرف بڑھتے ہیں

ملک مظفرؒ کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ اس کی تخت نشینی کے تھوڑے
ہی عرصہ بعد تاتاری شام کو پامال کرتے ہوئے فلسطین میں نمودار ہوئے لیکن ارضِ فلسطین
ان کی منزلِ مقصود نہیں تھی۔ اب تو وہ مصر پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔
فلسطین اور مصر کے درمیان ریگستان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہی تو حائل تھا۔ ان کو پختہ
یقین تھا کہ اس ذرا سے ٹکڑے کو پار کرنے کے بعد فراعنہ کی سرزمین اُن کے قدموں
کے نیچے ہو گی، دریائے نیل میں ان کی کشتیاں چلیں گی اور بحیرۂ روم کے نیلے پانی
کے کنارے ان کے عشرت کدے بنیں گے۔

ہر فرعونے را موسےٰ

معرکۂ عین جالوت

۱۵ رمضان المبارک سنہ ۶۵۸ ہجری

(۲۵ اگست سنہ ۱۲۶۰ عیسوی)

ہلاکو کا خط مملوک فرماں روا کے نام

آخر وہ وقت آہی پہنچا جس کا اہلِ مصر کو مدت سے دھڑکا لگا ہوا تھا، وسط ۶۵۸ھ کی ایک گرم صبح کو چند تاتاری سفارتی لبادے اوڑھے قاہرہ میں داخل ہوئے اس زمانے میں قاہرہ کے گلی کوچے پناہ گزینوں سے بھرے ہوئے تھے جو اپنی مظلومی اور تاتاریوں کی قوت اور بربریت کی کہانیاں دہرا رہے تھے۔ تاتاری سفیروں کے اچانک ورود نے قاہرہ میں خوف اور غیظ و غضب کی ملی جلی فضا پیدا کر دی ــــ یہ سفیر مملوک فرماں روا کے نام اپنے ایل خاں کا خط لائے تھے اس خط میں ہلاکو نے ملک مظفر کو لکھا تھا:

"یہ اس کا فرمان ہے جو ساری دنیا کا آقا ہے۔ اپنی شہر پناہیں منہدم کر دو اور اطاعت قبول کر لو۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں امن چین سے زندہ رہنے دیا جائے گا اور اگر تم نے یہ بات نہ مانی تو پھر تم کو جو کچھ پیش آئیگا وہ بلند و بالا جاودانی آسمان کے سوا کوئی نہیں جانتا[1]"

تاتاری سفیروں کا قتل

مملوک سپاہیوں کے ایک دستے نے تاتاری سفیروں کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور برہنہ تلواروں کے سائے میں ان کو شاہی دربار میں لے گئے یہ سفیر اکڑ اکڑ کر چل

---

[1] تاتاری ارواح پرست تھے ان کا عقیدہ تھا کہ کائنات کی ہر شے ایک روح رکھتی ہے اور نیک و بد روحوں کو انسانوں کی زندگی پر بڑی حد تک تصرف حاصل ہے۔ جاودانی اور بلند و بالا آسمان کی روح سب سے بڑی اور طاقتور ہے۔

رہے تھے اور ان کا رویہ بڑا گستاخانہ تھا۔ انہوں نے آداب شاہی کا لحاظ کیے بغیر اپنے آقا کا خط ملک مظفر کے سامنے پھینک دیا اور شعلے برساتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کے ردِ عمل کا انتظار کرنے لگے۔

مملوک فرماں روا نے خط پڑھوا کر سنا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تاہم اس نے نہایت تحمل سے کام لیا اور تاتاری سفیروں سے کہا کہ ہم نے ہلاکو خاں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ مصر کو اپنے حال پر چھوڑ دے اور ہمارے امن و امان میں خلل نہ ڈالے۔

تاتاری سفیر ملک مظفر کا جواب سن کر لال بھبوکا ہو گئے اور انہوں نے چلّا کر کہا

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا وہی حشر ہو جو بغداد کے مغرور خلیفہ کا ہو چکا ہے۔ اچھی طرح سے سمجھ لو کہ ہمارے آقا کی قوّت لا محدود ہے اور دنیا کی کوئی طاقت اس سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ وہ خوب جانتا ہے کہ تم جیسے خود سر حکمرانوں اور ان کی رعیت سے کیا سلوک کرنا چاہیئے۔"

ملک مظفّر نے ان کو بہتیرا سمجھایا کہ اپنی روش سے باز آجائیں لیکن ان کا لب و لہجہ درشت سے درشت تر ہوتا گیا — فی الواقع ان کا رویّہ سفارتی آداب کے قطعاً منافی تھا۔ ملک مظفر نے ان کی بدتمیزیوں کو کافی دیر تک برداشت کیا لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے آخر اس کی قوّتِ صبر و ضبط جواب دے گئی — دربار میں امیر بیبرس بندقداری اور دوسرے عمائد سلطنت بھی موجود تھے ان میں سے کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ تاتاریوں کی غیر مشروط اطاعت قبول کر لینی چاہیئے لیکن امیر بیبرس اور دوسرے بہت سے غیرت مند اکابرِ دربار کا خیال تھا کہ تاتاریوں کے عہد و پیمان کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ مصر مسلمانوں کی آخری امید گاہ ہے اور اسکی حفاظت کے لیے سر پر کفن باندھ کر لڑنا چاہیئے ملک مظفر شروع ہی سے موخر الذکر

ملنے کا ہم خیال تھا۔ تاتاری سفیروں کے رویے نے اس کو اپنے عزم و یقین میں اور پختہ کر دیا اور اس نے غضب ناک ہو کر حکم دیا کہ اُن کتوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لو اور ان کے سر قلم کر دو۔ یہی ہلاکو خاں کو ہمارا جواب ہے ـــ بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی مملوک سپاہی شوریدہ سر سفیروں پر جھپٹ پڑے اور آناً فاناً ان کو خاک و خون میں لوٹا دیا ـــ چند ساعت بعد اہلِ قاہرہ نے دیکھا کہ تاتاری سفیروں کی لاشیں شہر کی اہم گزرگاہوں میں لٹکی ہوئی ہیں۔

جہاد کی تیاری

ملک مظفر نے تاتاری سفیروں کو قتل کر کے گویا ہلاکو خاں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا تھا۔ اب اہلِ مصر کے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ لڑ کر فتح حاصل کریں یا اپنی جانیں قربان کر دیں۔ ان کے لیے یہ بات بڑی امید افزا تھی کہ تاتاریوں سے نبرد آزما ہونے کا بیڑا منصورہ کے مردِ میدان امیر بیبرس بندقداری نے اٹھا لیا ہے وہ ایک بانکا سپاہی اور نڈر جرنیل تھا تاتاریوں کی قوت اور طاقت کے افسانے سن کر وہ قہقہے لگایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ وقت آنے دو ہم ان مغرور وحشیوں کو بتا دیں گے کہ صرف وہی لڑنا نہیں جانتے دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کا پنجہ مروڑ سکتے ہیں۔ تاتاری سفیروں کی لاشیں اسی کے حکم سے قاہرہ کے اہم مقامات پر لٹکائی گئی تھیں، اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ تاتاری سفیروں کی آمد سے قاہرہ کے بعض لوگوں پر جو دہشت طاری ہوئی تھی وہ دور ہو جائے۔ ملک مظفر نے اس کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا اور وعدہ کیا کہ اگر وہ تاتاریوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تو حلب کی ولایت اس کو دے دی جائے گی۔ بیبرس نے جہاد کی تیاری کرنے میں دن رات ایک کر دیے، اس نے قاہرہ کے ہر تندرست اور بالغ مرد کے لیے فوجی خدمت لازمی قرار دے دی

اور حکم دیا کہ جو شخص کسی معقول عذر کے بغیر فوج میں بھرتی ہونے سے گریز کرے اس کو کوڑے لگائے جائیں۔ اہلِ قاہرہ کے علاوہ بیبرس نے اپنی فوج میں پناہ گزین ترکمانوں، عرب بدوؤں اور مصر بلند کے جوّرہ قبائلیوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی بھرتی کر لیا تھا یہ لوگ بڑے نڈر اور اعلیٰ درجے کے جنگجو تھے اور ان کی شجاعت پر ہر حالت میں بھروسا کیا جا سکتا تھا تھوڑے ہی دنوں میں بیبرس کے جھنڈے کے نیچے ایک جرار لشکر اکٹھا ہو گیا۔ اس لشکر کا سب سے اہم اور فعّال عنصر وہ تھا جس کی تشکیل مملوک دستوں سے کی گئی تھی۔ ان مملوکوں کو کئی سال تک اعلیٰ درجہ کی عسکری تربیت دی گئی تھی اور اب وہ فنّ حرب و ضرب میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ یہ لوگ دشتِ قبچاق کے رہنے والے تھے اور تاتاری ان کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھے دراصل یہی وہ لوگ تھے جو تاتاریوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے تھے اور ان کے پنجے میں پنجہ ڈال کر لڑ سکتے تھے۔

ہلاکو کی مراجعتِ وطن

جن دنوں قاہرہ میں یہ واقعات پیش آ رہے تھے۔ ایل خاں ہلاکو کو اطلاع ملی کہ اس کا بھائی منگو خاں جو تاتاریوں کا خانِ اعظم (قاآن یا خاقان) تھا مر گیا ہے اور اس کا جانشین نامزد کرنے کے لیے مغل سرداروں کا جو اجتماع ہو رہا ہے اس میں ہلاکو کی شرکت ضروری ہے۔

ہلاکو کے سپہ سالار اور اس کی بیوی دوقوز خاتون نے اصرار کیا کہ ہماری یلغار جاری رہنی چاہیئے کیونکہ خانِ اعظم نے جو اب مر چکا ہے حکم دیا تھا کہ مصر کا خاتمہ کر دیا جائے۔ لیکن ہلاکو نے ان کی بات نہ مانی وہ مغل سرداروں کے اجتماعِ عظیم (قرولتائی) میں شرکت کو دوسری سب باتوں پر مقدم سمجھتا تھا اس نے اپنے بھائیوں کو پیغام بھیجا کہ وہ وطن واپس

اُڑ رہا ہے اس کے ساتھ ہی اُس نے اپنی فوجوں کو حکم دیا کہ قفقاز کے کنارے کنارے شمال کا رخ کرلو ہم گھاس سوکھنے سے پہلے پہلے اپنے وطن پہنچنا چاہتے ہیں لیکن پھر یکایک اس کو کوئی خیال آیا اور اس نے اپنے نائب اور سپہ سالار کتبغا (قطبوغا)[1] کو اپنے پاس بلایا اور اس سے کہا کہ ہمارے جانے کے بعد اس علاقے کی حفاظت تمہارے ذمہ ہے جب تک ہم قرولتائی سے فارغ ہو کر واپس نہ آئیں تم یہیں رہو گے ہم تمہارے ماتحت ایک زبردست لشکر چھوڑے جاتے ہیں ہمارے ارمنی اور گرجستانی حلیف بھی تمہاری اعانت کے لیے یہاں موجود رہیں گے ـــ کتبغا نے ایل خاں کے حکم کے سامنے سر جھکا دیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ جو فرض اسے سونپا گیا ہے وہ دل و جان سے اس کو پورا کرے گا۔ اس کے بعد ہلاکو اپنے عظیم الشان خیمہ و خرگاہ کے ساتھ صحرائے گوبی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب شام اور عراق مکمل طور پر کتبغا کی گرفت میں تھے وہ ہلاکو کا نہایت قابلِ اعتماد جرنیل تھا اور شام کو پامال کرنے میں اس نے خاص حصہ لیا تھا۔ وہ ایک شقی القلب انسان تھا اور اس کی بربریت کے افسانے سارے عالمِ اسلام میں مشہور تھے۔ ہلاکو کے جانے کے بعد اس نے فلسطین میں عین جالوت (Ain Jalut) کے مقام پر چھاؤنی ڈال دی مشہور شہر ناصرہ (Nazareth) کے قریب یہ مقام اس کے لشکر کے قیام کے لیے نہایت موزوں تھا یہاں سے وہ ایک طرف شام اور عراق پر اپنا تسلط مؤثر طور پر قائم رکھ سکتا تھا اور دوسری طرف جب چاہے مصر کی طرف بڑھ سکتا تھا۔

معرکۂ عین جالوت

ہلاکو کی مراجعت کی اطلاع بہت جلد قاہرہ پہنچ گئی۔ اہلِ مصر کی تمام جنگی تیاریاں

---

[1] (Kitboga) فلپ کے حتی کا بیان ہے کہ کتبغا دین مسیحی کا پیرو تھا۔ اس نے شام کو بہت بری طرح پامال کیا اور لوٹا تھا۔ (تاریخ شام از حتی)

ابھی تک دفاعی نوعیت کی تھیں لیکن اب بیبرس نے یکایک ایک ایسا فیصلہ کیا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا ــــ اس نے اعلان کیا کہ ہماری فوج آگے بڑھ کر کتبغا کے لشکر سے نبرد آزما ہوگی ــــ اس وقت رمضان المبارک کا آغاز ہو چکا تھا۔ بیبرس کے اعلان نے اس کے سپاہیوں کو اس مقدس مہینے میں جہاد کی افضل ترین عبادت سے سعادت اندوز ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے بڑی خوش دلی سے اس کا فیصلہ قبول کر لیا۔ اب وہ اپنے لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے فلسطین میں داخل ہوا۔ فوج کے متعدد دستے صلیبیوں کے قلعوں کے چاروں طرف پھیلا دیئے تاکہ وہاں سے کتبغا کو کوئی مدد نہ پہنچ سکے۔ اگر صلیبیوں کے کسی سرپھرے گروہ نے مسلمانوں سے مزاحم ہونا چاہا تو اس کو مصری فوج کے ہراول دستوں نے مار ہٹایا۔ غرض اسلامی لشکر کسی خاص مزاحمت کے بغیر بہت جلد تاتاری لشکر گاہ کے قریب پہنچ گیا اور اس سے کچھ فاصلے پر پڑاؤ ڈال دیا۔

بروز جمعہ ۱۵ رمضان المبارک ۶۵۸ھ (۲۵ اگست ۱۲۶۰ء) کو دونوں لشکر عین جالوت کے مقام پر ایک دوسرے سے متصادم ہوئے[1]۔ اس گھمسان کا رن پڑا کہ ارض و سما کانپ اٹھے۔ بیبرس نے اس معرکے میں حیرت انگیز عسکری صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔ اس نے مملوک جنگجوؤں پر مشتمل اپنی فوج کے بہترین دستوں کو گھات

---

[1] اس لڑائی میں فریقین کے لشکروں کی تعداد کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے اوپر تھی اور کتبغا کے پاس دس ہزار تاتاری جنگجو تھے ان کے علاوہ گرجستانی اور ارمنی عیسائیوں کی ایک کثیر تعداد بھی انہی کے ساتھ تھی۔ ایک دوسری روایت کے مطابق دونوں فریق عسکری نقطۂ نگاہ سے ایک دوسرے کے ہم پلّہ تھے۔

میں بٹھا دیا اور پہلے اپنی ہلکی سوار فوج کو بڑے وسیع رقبے میں پھیلا کر آگے بڑھایا۔

تاتاریوں نے پوری قوت سے مصری سواروں پر حملہ کیا اور ان کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اندھا دھند آگے بڑھنے لگے۔ بیبرس نے اپنے سواروں کو تاکید کی تھی کہ وہ جم کر مقابلہ نہ کریں بلکہ تاتاری حملے کا آغاز ہوتے ہی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیں چنانچہ انہوں نے اسی کے مطابق عمل کیا یہاں تک کہ تاتاری ان مملوک دستوں کی زد میں آ گئے جو گھات میں بیٹھ کر تاتاریوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔

یکایک وہ تکبیر کے نعرے بلند کرتے ہوئے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر تاتاریوں پر ٹوٹ پڑے اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال سکتے مملوک دلاوروں نے ان کے ہزاروں سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ کتبغا کے لیے یہ حملہ بالکل غیر متوقع تھا اس نے اپنی صفوں کو دوبارہ مرتّب کرنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اس کی سب تدبیریں دھری کی دھری رہ گئیں مسلمانوں کے تیز و تند حملوں نے تاتاری لشکر کے پرخچے اڑا دیئے۔ گرجستانی اور آرمنی پیدل دستوں کا تو اور بھی برا حشر ہوا مملوک شہسواروں نے ان کو بالکل ہی روند ڈالا۔ غرض چند گھنٹے کے اندر اندر تاتاریوں کو ایسی کمر توڑ شکست ہوئی کہ پچھلے چالیس سالوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ کتبغا عین میدانِ جنگ میں اپنے کئی ساتھیوں سمیت مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔ یہ درندہ صفت انسان شام کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑ چکا تھا اور کسی رعایت کا مستحق نہیں تھا چنانچہ جب وہ بیبرس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے بلا تامل اس کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ قتل ہونے سے پہلے اس نے ڈینگ ماری کہ

"مسلمانوں نے میدان جیت لیا ہے تو کیا ہوا کیا مغلوں کی گھوڑیوں نے بچے جننا چھوڑ دیا ہے یا ان کی عورتیں بانجھ ہو گئی ہیں؟ میرے مرنے کے بعد مغل شہسوار اس شکست کا بدلہ ضرور

لیں گے اور تمہیں اور تمہارے ملک کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل ڈالیں گے۔"

بیبرس نے کتبغا کی ڈینگ کا جواب خندۂ استہزاء کے ساتھ دیا اور اس کا سر قلم کرا کر نمائش کے لیے قاہرہ بھیج دیا[1]۔ اس کے ساتھیوں کو بھی پا بجولاں قاہرہ بھیجا گیا، جہاں ان کو گلیوں میں پھرا کر حوالۂ تیغ کر دیا گیا[2]۔ اس طرح وہی تاتاری جن کے متعلق مشہور تھا کہ ان کو کوئی شکست نہیں دے سکتا اُن کا عبرت ناک انجام اہلِ قاہرہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

معرکۂ عین جالوت کا شمار تاریخ کی فیصلہ کُن لڑائیوں میں ہوتا ہے اگر خدانخواستہ اس لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو دنیا میں ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہتی اور ان کی تہذیب و تمدن اور تاریخ و ثقافت بالکل برباد ہو جاتی چنانچہ تمام عالمِ اسلامی میں اس فتح پر بے پناہ مسرّت کا اظہار کیا گیا اور شکرانے کی نمازیں پڑھی گئیں۔ اگر بیبرس اور کچھ بھی نہ کرتا تو صرف اسی ایک معرکے میں اس کی کامیابی اس کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں امتیازی مقام دلانے کے لیے کافی تھی

---

[1] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ کتبغا نے یہ ڈینگ مارنے کے بعد میدانِ جنگ میں خودکشی کر لی۔ کچھ دوسرے مؤرخین کا بیان ہے کہ کتبغا لڑتا ہوا مارا گیا اور مسلمانوں کو اس کی لاش تاتاری مقتولوں میں ملی ـــ بہرصورت اس کا سر یا مُردہ جسم قاہرہ بھیجا گیا جہاں اس کی خوب تشہیر ہوئی۔

[2] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ان مغل قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے ان کے ہاتھ پاؤں توڑے گئے کیونکہ انہوں نے مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے تھے ان قیدیوں میں کتبغا کا بیٹا بھی شامل تھا۔

ہلاکو خاں ابھی اپنے وطن کے راستے ہی میں تھا کہ اس کو اپنے لشکر کی ذلت انگیز شکست اور کتبغا کے قتل کی اطلاع ملی۔ اس وحشت ناک خبر کو اس نے حیرت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سنا اور جب اس کو کتبغا کے آخری الفاظ سے آگاہ کیا گیا تو اسے بڑی غیرت آئی لیکن اب اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے سینکڑوں میل دور جانا بڑا کٹھن کام تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اس وقت وطن کی طرف سفر جاری رکھا جائے اور خرولتائی سے فارغ ہو کر مصر کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے۔ لیکن اسے کیا خبر تھی کہ معرکۂ عین جالوت فتنۂ تاتار کے ردّعمل کا آغاز تھا اور اب مغل کتبغا کی ڈینگ کو کبھی پورا نہیں کر سکیں گے۔

شام سے تاتاریوں کا مکمل انخلاء

بیبرس نے معرکۂ عین جالوت میں تاتاریوں کو شکست دے کر ان کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی تھی لیکن اس کا کام ہنوز تشنۂ تکمیل تھا کیونکہ حلب۔ حماۃ۔ دمشق اور شام کے کئی دوسرے شہروں میں تاتاری ابھی تک دندنا رہے تھے۔ بیبرس نے ایک طوفانی یلغار میں ان تاتاریوں کو جا لیا اور تابڑتوڑ شکستیں دے کر ان کو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اپنی اس طوفانی مہم میں بیبرس نے ان تمام غداروں کو بھی بیدریغ قتل کر دیا جنھوں نے تاتاریوں کے ساتھ تعاون کیا تھا اس طرح چند دن کے اندر اندر سرزمینِ شام تمام تاتاری غارت گروں اور ان کی حمایت کا دم بھرنے والے نام نہاد مسلمانوں سے یکسر پاک ہو گئی۔ اب بیبرس کا کام پورا ہو چکا تھا لیکن اسے خدشہ تھا کہ جونہی وہ مصر کو پلٹا تاتاری پھر شام میں آ گھسیں گے۔ اس خطرے کا تدارک کرنے کے لیے بڑے وسیع اور دُور رس اقدامات کی ضرورت تھی لیکن ان کے لیے وقت نہیں تھا کیونکہ سیاسی حالات کے پیشِ نظر وہ جلد از جلد قاہرہ واپس جانا چاہتا

تھا چنانچہ اس نے اس قسم کے اقدامات کو کسی آئندہ وقت پہ اٹھا رکھا البتہ فوج
کے چند مضبوط دستے شام میں مناسب مقامات پر تعینات کر دیئے اور خود باقی فوج
کے ساتھ فتح و نصرت کا پرچم اُڑاتا واپس قاہرہ پہنچ گیا ؞

بیبرس تختِ حکومت پر

(۱۷ ذی قعدہ سنہ ۶۵۸ ہجری / ۱۲۶۰ عیسوی)

بیبرس کی غیر معمولی ہر دلعزیزی
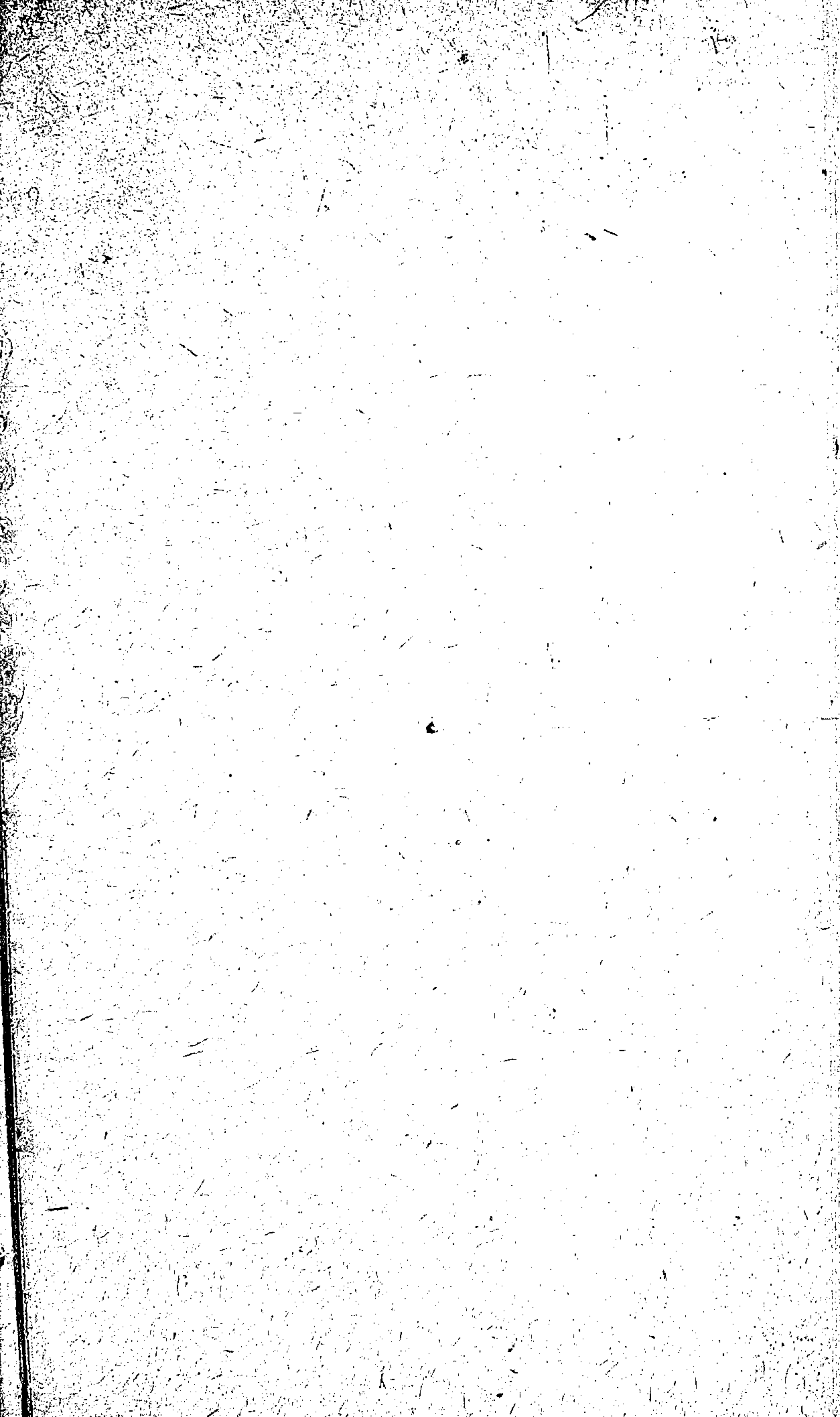
بیبرس نے منصورہ ۔ غزہ اور کئی دوسری لڑائیوں میں بے مثال شجاعت اور عسکری صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے مصر کی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا لیکن معرکۂ عین جالوت میں عظیم الشان فتح حاصل کر کے وہ تمام عالمِ اسلام اور بالخصوص اہلِ مصر کی آنکھوں کا تارا بن گیا ۔ چنانچہ جب وہ مظفر و منصور قاہرہ واپس آیا تو اہلِ مصر نے والہانہ جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا اور اس کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں ۔ فی الحقیقت عین جالوت کی فتح نے مصر اور شام میں بیبرس کی ہر دلعزیزی کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا اور وہ مسلمانانِ مصر و شام کا محبوب ترین قائد بن گیا ۔

ملک مظفّر کا قتل

ملک مظفّر نے برسرِ اقتدار آ کر کچھ ایسے اقدامات کئے تھے جو مملوک امراء کو ناگوار گزرے تھے لیکن تاتاریوں کے خطرہ کے پیشِ نظر وہ خاموش رہے ۔ اس خطرے کے دور ہوتے ہی اس کے خلاف جو آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی چنانچہ مملوک امرائے نے ایکا کر کے ۱۶ ذی قعدہ ۶۵۸ھ کو ملک مظفر کو قتل کرا ڈالا کہا جاتا ہے کہ بیبرس اور ایک دوسرے سرکردہ مملوک امیر فارس الدین اقطائی نے اس کے قتل میں نمایاں حصہ لیا ۔ بیبرس اور ملک مظفر کے درمیان اختلاف کا سبب بعض مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ ملک مظفر نے بیبرس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے تاتاریوں کو شام سے نکال دیا تو حلب کی ولایت اس کو دے دی

جائے گی لیکن جب بیبرس نے یہ کام پورا کر لیا تو ملک مظفرؔ اپنے وعدے سے پھر گیا۔ کچھ دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ ملک مظفرؔ بیبرس کی غیر معمولی ر(یا عوامی مقبولیت) سے خائف ہو گیا اور اس کو اپنے راستے سے ہٹانے کی تد سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے ایک یا دو مرتبہ بیبرس پر قاتلانہ حملہ کرایا۔ خوش قسمتی اس کو کوئی گزند نہ پہنچا لیکن اب اس نے بھی تہیہ کر لیا کہ ملک مظفر کو زندہ نہ چھوڑ مملوک فوج پہلے ہی اس کا دم بھرتی تھی۔ اس نے سرکردہ مملوک امراء کو بھی اپنے سا ملا لیا اور موقع پا کر ملک مظفر کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس سلسلے کی ایک اور روایت یہ ہے کہ شام سے تاتاریوں کے انخلا کے بعد ملک مظفر نے حلب کی ولایت والیٔ موصل بدر الدین لولو کے بیٹے علاء الد کو دے دی۔ چونکہ بغداد پر حملہ کے وقت بدر الدین لولو نے ہلاکو خاں کا ساتھ تھا اس لیے اس کے بیٹے کو حلب کا والی مقرر کیے جانے پر مملوک امراء اور لوگوں میں ملک مظفر کے خلاف ناراضی پھیل گئی اور یہی ناراضی اس کے قتل پر منتج ہوئی۔[1]

بیبرس کی تخت نشینی

ملک مظفر کے قتل کے بعد مملوک امرائے نے اتفاق رائے سے رکن الدین بیبرس کو اپنا سربراہ منتخب کر لیا اور ۱۷ ذی قعدہ ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء کو اس کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیا۔ اس کی تخت نشینی کے اعلان پر اہلِ مصر نے بڑے اطمینان اور مسرت

---

[1] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ ملک مظفر بھی بیبرس کے ساتھ شام گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی پر بیبرس نے اسے رستے میں ہی قتل کر دیا۔

کا اظہار کیا کیونکہ وہ بیبرس کے جذبۂ جہاد۔ شجاعت اور اعلیٰ کردار سے بخوبی آگاہ تھے اور سمجھتے تھے کہ نیا سلطان تاتاریوں اور صلیبیوں سے نپٹنے اور عوام کی امنگوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ فی التحقیقت بیبرس پہلا مملوک فرمانروا تھا جس کو نہ صرف مملوک امراء اور فوج کی مکمل حمایت حاصل تھی بلکہ عام لوگ بھی اس کے پرجوش مؤید تھے۔ سریر آرائے حکومت ہونے کے بعد بیبرس نے بھی بڑی فراخدلی سے کام لیا اور ان مملوک امراء کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جو ملک مظفر کے خاص آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انتقام و تعزیر کا چکچہ چلانے کے بجائے اس نے ان امراء کو نہ صرف اپنے مناصب پر بحال رکھا بلکہ اور بھی جو کچھ ہو سکتا تھا ان کی دلجوئی کے لیے کیا۔ اس طرح سب مملوک امراء بلا تخصیص دل وجان سے اس کے ہوا خواہ بن گئے۔

لقب

علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ

"رکن الدین بیبرس بندقداریؒ نے تخت حکومت پر بیٹھ کر اپنا لقب "الملک القاہر" مقرر کیا اور زین الملۃ والدین ابن الزبیر کو اپنا وزیر بنایا[1] وزیر نے ایک دن "القاہر" سے کہا کہ جس شخص نے اپنا لقب قاہر مقرر کیا اس نے کبھی فلاح نہیں پائی چنانچہ

---

[1] محمد بک الخضری نے "محاضرات الامم الاسلامیہ" میں لکھا ہے کہ بیبرس نے تخت نشین ہو کر بہاء الدین کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ معلوم نہیں کہ ابن الزبیر اور بہاء الدین ایک ہی شخصیت ہے یا دو مختلف شخصیتیں۔

القاہر بن المعتضد[1] نے یہ لقب اختیار کیا۔ وہ چند روز میں معزول کیا گیا اور اس کی آنکھیں نکلوا ڈالی گئیں۔ پھر والیٔ موصل نے اپنا لقب قاہر رکھا اس کو زہر دے دیا گیا اس پر سلطان نے اپنا لقب قاہر سے بدل کر "ظاہر" رکھ لیا۔ (تاریخ الخلفاء للسیوطی)

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان بیبرس نے پہلے اپنا لقب "الملک القاہر" رکھا لیکن جلد ہی اس کو بدل کر "الملک الظاہر" کر دیا۔ چنانچہ تاریخ میں وہ "الملک الظاہر" کے لقب ہی سے مشہور ہوا۔

ابتدائی زندگی

ملک الظاہر بیبرس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مؤرخین کے بیانات میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاہم مختلف روایات کی روشنی میں اس کی ابتدائی زندگی کا جو خاکہ سامنے آتا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ بیبرس ۶۱۹ھ ۱۲۲۳ء میں دشتِ قپچاق (وسط ایشیا) میں پیدا ہوا۔

۲۔ اس کی ولادت سے کئی سال پہلے بلخ، بخارا اور سمرقند وغیرہ کے مسلمان تاجروں کی تبلیغی مساعی کی بدولت دشتِ قپچاق میں اسلام پھیل چکا تھا۔ بیبرس ایک ایک مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا اور اس کا نام محمود رکھا گیا۔

۳۔ اس کے باپ کا نام یا لقب "جقجق" تھا جو خوارزم شاہی سلطنت میں ایک معزز عہدے پر فائز تھا بدقسمتی سے حکمرانِ وقت اس سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور اس کو پابندِ سلاسل کر دیا۔ اس طرح یہ خوشحال خاندان

---

[1] "القاہر" بغداد کے انیسویں عباسی خلیفہ ابو منصور محمد بن معتضد کا لقب تھا۔

گردشِ زمانہ کا شکار ہوگیا۔

۴۔ دشتِ قپچاق اور اس سے ملحقہ علاقوں کو تاتاریوں نے پامال کیا تو وہاں کے بے شمار بچوں اور نوجوانوں کو پکڑ کر اپنے ہمراہ لے گئے اور اُن کو بردہ فروشی کی مختلف منڈیوں میں فروخت کیا۔ کم سن محمود بھی اسی دار و گیر میں غلام بنا کر دمشق کی منڈی میں بقیمت بیس دینار سرخ فروخت کیا گیا۔

۵۔ محمود کو جس شخص نے خریدا وہ ایک مصری امیر تھا جس کا نام علی ابن الورقہ تھا۔

۶۔ علی ابن الورقہ ایک دوسرے مصری امیر کا مقروض تھا اس نے اس قرض کے عوض محمود کو اپنے قرض خواہ کو دے دیا۔

۷۔ اس دوسرے مصری امیر کی بیوی نے محمود کو اپنے صغیر السن لڑکے کی خدمت پر مامور کر دیا۔ ایک دن محمود سے کوئی لغزش ہوگئی۔ اس پر اس کی مالکہ نے اسے بری طرح پیٹا اس موقع پر امیر کی بہن فاطمہ نامی بھی موجود تھی اس کو محمود پر بڑا رحم آیا اور اس نے اپنی بھاوج سے کہا کہ اگر تم اس غلام کے کام سے خوش نہیں ہو تو اس کو میرے سپرد کر دو۔ وہ رضامند ہوگئی اور فاطمہ، محمود کو اپنے ساتھ دمشق لے گئی جہاں اس کا گھر تھا۔ فاطمہ کا ایک فرزند بیبرس نامی فوت ہوگیا تھا۔ حُسنِ اتفاق سے محمود کی شکل و صورت متوفی لڑکے سے بہت ملتی جلتی تھی چنانچہ فاطمہ اس کو بیبرس کہہ کر پکارتی[1] اور اس سے مادرانہ شفقت کے ساتھ پیش آتی۔ فاطمہ کا ایک بھائی، الملک الصالح نجم الدین ایوب کے دربار میں ایک معزز عہدیدار تھا ایک دفعہ وہ اپنی بہن سے ملنے دمشق آیا تو وہاں اس نے بیبرس کو دیکھا اور اس کے حالات سُنے۔ اس لڑکے کے اطوار اسے اس قدر پسند آئے کہ اس نے اس کو فاطمہ سے مانگ لیا اور اپنے ساتھ قاہرہ

---

[1] خدا کی قدرت کہ محمود نے تاریخ میں بیبرس ہی کے نام سے شہرت پائی۔

لے گیا۔ وہاں اُس نے بیبرس کو ملک صالح کی نذر کر دیا۔[1]

ترقی کے زینے پر

جیسا کہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے ملک صالح نے سرکیشی مملوکوں کو بڑی کثرت سے خرید کیا تھا اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیے خاص انتظامات کیے تھے۔ بیبرس نے بھی ملک صالح کی سرپرستی میں کتابی علوم اور حربی فنون میں اعلیٰ درجہ کی مہارت حاصل کی اور اس کے بعد حسب دستور مملوک فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اپنی غیر معمولی جسمانی قوت، ذہانت اور وجاہت کی بدولت وہ بہت جلد فوج کے ایک دستے کا افسر بن گیا۔ تاہم اس نے ابھی تک کوئی خاص شہرت حاصل نہ کی تھی۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ساتویں صلیبی جنگ چھڑ گئی۔ اسی جنگ کے دوران میں منصورہ کا فیصلہ کن معرکہ پیش آیا جس میں نوجوان بیبرس نے حیرت انگیز عسکری صلاحیت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور دفعتہً شہرت اور ناموری کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ اس کے بعد اُس نے کئی اور لڑائیوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے اور چند سال کے اندر اندر نہ صرف فوج بلکہ ملکی سیاست میں بھی اس کا ایک مقتدر شخصیت تسلیم کیا جانے لگا۔ معرکۂ عین جالوت میں عظیم الشان فتح حاصل کرنے کے بعد تو عوامی مقبولیت کے لحاظ سے مصر اور شام کی کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جو اس کی برابری کا دم بھر سکے۔ یہ اس کی عوامی مقبولیت اور ذاتی صلاحیتیں ہی تھیں جنہوں نے اس غریب الوطن غلام کو مصر کے تاج و تخت کا مالک بنا دیا۔

---

[1] فلپ کے حتی نے تاریخ لبنان میں لکھا ہے کہ بیبرس آٹھ سو درہم کے عوض دمشق کی منڈی میں فروخت ہوا لیکن خریدار نے یہ کہہ کر سودا فسخ کر دیا کہ لڑکے کی کرنجی آنکھوں میں سقم ہے۔ الملک الصالح نے حماۃ کے ایک شخص سے اسے خرید لیا۔

حکومت کا ابتدائی دور

سلطان بیبرس نے برسرِ اقتدار آتے ہی اُن مفاسد کا قلع قمع کرنے کی طرف توجہ کی جو اس کے پیشروؤں بالخصوص ملک مظفر کے عہدِ حکومت میں پیدا ہو چکے تھے چنانچہ اس نے کسی تاخیر کے بغیر ہر قسم کے ناجائز ٹیکسوں اور محصولات کو یک قلم موقوف کر دیا اور تمام شراب خانوں، قحبہ خانوں اور قمار بازی کے اڈوں کو سختی کے ساتھ بند کرا دیا تاہم وہ ملک کی تعمیر و ترقی اور معاشرتی اصلاح کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا چاہتا تھا اور یہ اقدامات اس سلسلہ میں محض اوّلیات کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اس وقت اس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ شام کو تاتاریوں کے خطرے سے محفوظ کرنا تھا کیونکہ خدشہ تھا کہ وہ عین جالوت کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے کسی وقت بھی دوبارہ شام پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرتا تھا کہ شام کی بقاء کا انحصار مصر سے مکمل الحاق پر ہے اور جب تک وہ تمام حکمران اور رؤسا جو شام میں متعدد چھوٹی چھوٹی املاک اور ریاستوں پر قابض تھے مصر کی بالادستی تسلیم نہیں کر لیتے شام ہمیشہ تاتاریوں اور صلیبیوں کے حملوں کی زد میں رہے گا۔ چنانچہ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ اپنی تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد ایک طاقتور فوج کے ساتھ شام میں داخل ہُوا اور دمشق میں ایک دربار منعقد کر کے شام کے عمائد و اکابر کو اپنی بیعت کی دعوت دی خوش قسمتی سے شام کے لوگ بہت زیرک ثابت ہوئے انھوں نے بلا تامل اس کی اطاعت قبول کر لی اور شام پر قاہرہ کی مملوک حکومت کی سیادت تسلیم کر لی۔ سلطان نے بھی اہلِ شام کو ہر معاملہ میں اہلِ مصر کے مساوی حقوق عطا کیے اور اعلان کیا کہ شام سلطنت اسلامیہ مصر کا دوسرا بازو ہے اور دمشق اس متحدہ سلطنت کا دوسرا مرکزِ حکومت۔ تالیفِ قلب

کے طور پر اس نے شام کے بعض شہروں اور ریاستوں میں قدیم خاندانوں کی سیادت برقرار رکھی لیکن ان پر یہ شرط عائد کر دی کہ وہ مرکزی حکومت کے احکام اور آئین کے پابند ہوں گے۔ اس طرح شام بھی مملوک سلطنت کا ایک باقاعدہ حصہ بن گیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس دور کے شام میں وہ تمام علاقے بھی شامل تھے جو آجکل لبنان۔ اردن اور فلسطین (اسرائیل) کا حصہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے ساحلی شہروں اور علاقوں پر صلیبیوں کا قبضہ تھا۔ شام کے اندرونی انتظامات سے فارغ ہو کر سلطان نے اس کی سرحدوں کے مؤثر دفاع کیلئے کئی اہم اقدامات کیے ان میں سے ایک دفاعی تدبیر یہ تھی کہ اس نے حلب سے حدود عراق تک تمام جنگلوں اور گھاس کے خطوں میں آگ لگوا دی تاکہ حملہ آور لشکر آسانی سے پیش قدمی نہ کر سکے[1] غرض قاہرہ واپس جانے سے پہلے اس نے اس بات کا اطمینان کر لیا کہ ایلخانی مغل اگر دوبارہ شام کا رخ کریں تو ان کو دندان شکن جواب دیا جا سکے گا۔

---

[1] بعض مؤرخین کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان نے یہ تدبیر اس وقت اختیار کی جب وہ خلافت عباسیہ کا احیاء کرنے کے بعد شام کے دورے پر آیا۔ بہرصورت اس قسم کے تمام دفاعی اقدامات سلطان کی حکومت کے ابتدائی دور سے ہی تعلق رکھتے ہیں اس زمانے میں اس کا ایک قدم قاہرہ میں ہوتا تھا اور دوسرا دمشق میں۔ اس نے ایلخانی مغلوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر رکھا تھا اور اس کے بیل و نہار انہی کو روکنے کی تدبیروں میں گزرتے تھے۔

خلافتِ عبّاسیہ کا اِحیاء

۶۵۹ھ
۱۲۶۱ء

احیائے خلافت کا پس منظر

۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء میں سقوطِ بغداد کے ساتھ عباسی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا تھا۔ یہ خلافت بُری بھلی جیسی بھی تھی بہر صورت مسلمانانِ عالم کے نزدیک عمومی طور پر مرکزیتِ ملت کا درجہ رکھتی تھی اور اس کے ختم ہو جانے سے وہ اپنی دینی اور سیاسی زندگی کے اندر گہرا خلا محسوس کر رہے تھے[1] سلطان بیبرس بھی اس معاملہ میں عامۃ المسلمین کے جذبات سے بخوبی آگاہ تھا چنانچہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ خلافتِ عباسیہ کا از سرِ نَو احیاء کیا جائے اور سرِ دست اس کا مرکز قاہرہ میں قائم کیا جائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اہلِ مصر مملوکوں کے استحقاقِ حکومت کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہی چیز احیاءِ خلافت کی محرّک ہوئی لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ مملوک عسکری اور سیاسی لحاظ سے اس قدر طاقتور تھے کہ خلافت کے بغیر بھی حکومت کا کاروبار نہایت آسانی سے چلا سکتے تھے تو ہمیں یہ خیال صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ دراصل خلافت کے احیاء سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مملوک حکومت کو دنیائے اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہو جائے کیونکہ مسلمانوں کو خلافت سے ایک قسم کی دینی

---

[1] خلافتِ عباسیہ کے آغاز سے سقوطِ بغداد تک کے درمیانی عرصے میں اندلس، شمالی افریقہ اور مصر میں طویل عرصے تک متوازی خلافتیں بھی قائم رہیں لیکن ان کا اثر و اقتدار کچھ مخصوص علاقوں تک محدود رہا اور مرکزیت کا درجہ انہیں کبھی حاصل نہ ہو سکا۔

اور روحانی وابستگی تھی اور اس کے بغیر ان کی ملی اُمنگیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس معاملے میں سلطان بیبرس کے دینی جذبہ اور ذاتی رجحانات کو بھی کافی دخل تھا۔ خلافت کے احیاء کا فیصلہ تو وہ حکومت سنبھالنے کے پہلے دن ہی کر چکا تھا دیر اب یہ تھی کہ عباسی خاندان کا کوئی ایسا فرد مل جائے جس کو مسندِ خلافت پر بٹھایا جا سکے۔

ایک عبّاسی شہزادہ

سقوطِ بغداد کے وقت ایک عباسی شہزادہ ابوالقاسم احمد قید میں تھا[1] اس ہنگامے میں جب بغداد کے قید خانوں سے قیدی نکل کر بھاگ گئے تو اُن کے ساتھ وہ بھی نکل کر بھاگ گیا اور ساڑھے تین سال تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ اتفاق سے الملک الظاہر بیبرس کو اس کی جائے قیام کا علم ہو گیا چنانچہ اس نے بنو مہارش کے دس آدمیوں کا وفد اس کے پاس بھیجا اور اس کو مصر آنے کی دعوت دی۔ ابوالقاسم احمد نے یہ دعوت قبول کر لی اور اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ عازمِ مصر ہو گیا۔[2]

ابُوالقاسم احمد کا ورودِ مصر

ابوالقاسم احمد جب مصر میں داخل ہُوا تو اس نے عباسی خلفاء کا خاص

---

[1] ابوالقاسم احمد بغداد کے پینتیسویں عباسی خلیفہ الظّاہر بامر اللہ کا فرزند چھتیسویں خلیفہ المستنصر باللہ کا بھائی اور سینتیسویں (مقتول) خلیفہ المستعصم باللہ کا چچا تھا۔

[2] بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ بنو مہارش کا وفد ابوالقاسم احمد نے سلطان بیبرس کے پاس بھیجا اور اس کو اپنی جائے قیام اور حسب و نسب سے مطلع کیا۔

ایک روایت کے مطابق ابوالقاسم احمد ان دنوں دمشق میں مقیم تھا۔

لباس زیبِ تن کر رکھا تھا سلطان بیبرس نے قضاۃ و علماء اور اعیانِ سلطنت کے ساتھ آگے بڑھ کر اُس کا پرجوش استقبال کیا اور اس کو نہایت عزت و احترام سے ایک شان دار جلوس کے ہمراہ قاہرہ لایا۔ سلطان نے اُس دن تمام شہر کی بڑے پیمانہ پر آئینہ بندی کرائی تھی اور قاہرہ میں اس دن ایک عظیم الشان جشن کی کیفیت تھی رات کو اس خوشی میں تمام شہر میں چراغاں کیا گیا۔ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے کہ دودمانِ عباسی کے اس چشم و چراغ کے ورودِ قاہرہ کے موقع پر اظہارِ مسرت کے لیے جو تقریبات منعقد کی گئیں اور شہر کی آرائش و چراغاں کا جو اہتمام کیا گیا ان پر ایک کروڑ دینار سے زائد خرچ ہوئے[1] ابوالقاسم احمد کو قلعہ جبل میں ٹھہرایا گیا۔ سلطان بیبرس نے پہلے دن سے ہی اس کی تعظیم و تکریم میں ایسا طرزِ عمل اختیار کیا کہ گویا وہ اُس (ابوالقاسم احمد) کو اپنا سردار سمجھتا ہے۔ چنانچہ اس نے ابوالقاسم سے پہلے

---

[1] ابوالقاسم احمد کے استقبال پر اتنی کثیر رقم کے صرف کو جب اس پس منظر میں دیکھا جائے کہ اس زمانے میں اہلِ مصر کو تاتاریوں اور صلیبیوں کے خلاف اپنے دفاع کے لیے ایک ایک پائی کی ضرورت تھی تو بڑی حیرت ہوتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مصر اس وقت مالی لحاظ سے نہایت خوشحال تھا اور مسلمانانِ مصر کے نزدیک "ہونے والے خلیفہ" کا ورودِ مصر اتنا اہم اور مسرت بخش تھا کہ اس تقریب پر خواہ کس قدر روپیہ صرف ہو جاتا جائز تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اس کثیر خرچ پر ملک کی آبادی کے کسی گوشے میں اعتراض و احتجاج کی ہلکی سی لہر بھی پیدا نہ ہوئی۔ فی الحقیقت اس وقت مسلمان خلافت کے بغیر دنیائے اسلام کو بے نور سمجھ رہے تھے اور احیاءِ خلافت کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ یہ ظلمت کدہ پھر روشن ہو رہا ہے اور اس مبارک موقع پر جس قدر بھی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

قلعہ میں داخل ہونے یا اس کے برابر بیٹھنے اور گفتگو میں ہمسری یا بے تکلفانہ رویہ اختیار کرنے سے اجتناب کیا۔ اس طرزِ عمل کا سبب مسلمانوں کا دینی جذبہ تھا یا اس کی سیاسی حکمتِ عملی، بہرصورت اس نے عباسی شہزادے کے ادب و احترام میں حد سے زیادہ اہتمام کیا۔

احیائے خلافت

۱۳ رجب المرجب ۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء بروز دوشنبہ سلطان بیبرس نے ایک عالی شان دربار منعقد کیا جس میں ابوالقاسم احمد کے علاوہ تمام قضاۃ، علماء، امراءِ حکومت اور ملک کے دوسرے بہت سے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ ابوالقاسم احمد اگرچہ کوئی مجہول النّسب شخص نہ تھا تاہم ضابطہ کی کارروائی کے طور پر قاضی القضاۃ تاج الدین بن بنت الاعزّ نے بہت سے ثقہ اور معزّز لوگوں سے شہادت لی کہ ابوالقاسم احمد فی الواقع خاندان عباسؓ بن عبدالمطّلب سے تعلق رکھتے ہیں اور خلیفہ الظاہر بامر اللّٰہ بن الخلیفہ الناصر لدین اللّٰہ کے فرزند ہیں۔ جب دربار میں موجود قاضیوں اور فقیہوں نے ان شہادتوں کو شرعی لحاظ سے معتبر قرار دیا تو قاضی القضاۃ نے ان کے قبول کرنے کا اعلان کیا اور ابوالقاسم احمد کو خلافت کا جائز حقدار قرار دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ابوالقاسم احمد کے ہاتھ پر بیعتِ خلافت کی پھر شیخ الاسلام علامہ عزّ الدین بن عبدالسلام اور دوسرے تمام شرکاءِ اجتماع نے بیعت کی اور خلیفہ کو "المستنصر باللّٰہ" کا لقب دیا (یا بروایت دیگر یہ لقب خلیفہ نے خود اپنے بھائی کے لقب پر اختیار کیا)۔ آخر میں سلطان بیبرس نے خلیفہ کے ہاتھ پر قرآن و حدیث، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللّٰہ اور مالیات کے شرعی نظام کے قیام پر بیعت کی۔ اس کے بعد سلطان نے ملک کے مختلف طبقوں سے

خلیفہ کے لیے بیعت لی[1] اور سکہ اور خطبہ میں اس کا نام رائج کرنے کا فرمان جاری کیا اس طرح مصر میں دوبارہ خلافتِ عباسیہ قائم ہو گئی۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ قیامِ خلافت کے بعد ملک ظاہر بیبرس نے خلیفہ کے لیے ارباب مناصب مثلِ اتابک۔ استاد دار۔ آبدار (شربدار) حاجب کاتب۔ خزانچی وغیرہ مقرر کر دیئے اور خزانہ کا ایک حصہ اس کے تصرف میں دے دیا۔ سو گھوڑے، تیس خچر، دس قطار اونٹ وغیرہ خلیفہ کے اصطبل کے لیے مقرر کر دیئے اور اعزازی طور پر تمام سلطنت پر اس کا قبضہ کرا دیا۔

احیاءِ خلافت کے بعد پہلا جمعہ

قیامِ خلافت کے بعد پہلا جمعہ ۷ رجب المرجب ۶۵۹ھ کو آیا۔ اس دن خلیفہ سوار ہو کر ایک شاندار جلوس کی صورت میں جامع مسجد آیا اور نماز سے پہلے منبر

---

[1] بیعتِ خلافت کی ترتیب کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ اس سلسلہ کی دوسری مشہور روایات یہ ہیں:

۱۔ ابوالقاسم احمد کی صحتِ نسب کی تصدیق ہونے کے بعد سب سے پہلے شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام نے اس کی بیعت کی پھر سلطان بیبرس اور اس کے بعد قاضی القضاۃ تاج الدین نے بیعت کی اور پھر عام بیعت ہوئی۔

۲۔ سب سے پہلے ملک ظاہر بیبرس نے بیعت کی اس کے بعد علی الترتیب قاضی القضاۃ تاج الدین شیخ الاسلام عزالدین اور دوسرے علماء و فقہاء و اکابر سلطنت نے بیعت کی۔

واقعہ کی صورت کچھ بھی ہو اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تمام لوگوں نے بلا اختلاف ابوالقاسم احمد کو خلیفہ برحق تسلیم کر لیا اور اس کی بیعت کر لی۔

پر چڑھ کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا جس میں حمد و ثناء اور درود کے بعد پہلے بنو عباس کا شرف و مجد بیان کیا پھر خلافتِ عباسیہ کے دوبارہ قیام پر سلطان رکن الدین بیبرس کی بیحد تعریف و توصیف کی اور سلطان اور مسلمانوں کے لیے دعا مانگی۔ اس کے بعد اس نے منبر سے اُتر کر جمعہ کی نماز پڑھائی جب لوگ نماز سے فارغ ہو گئے تو خلیفہ نے قدیم رسم کے مطابق سلطان کو خلعت عطا کیا۔

سلطان کو شرعی نیابت کی تفویض

۴ شعبان المعظم ۶۵۹ھ بروز دوشنبہ خلیفہ کی طرف سے سلطان بیبرس کو شرعی نیابت کی تفویض کے لیے قاہرہ میں ایک عظیم الشان دربارِ عام منعقد ہوا۔ شہر سے باہر ایک وسیع میدان میں ایک طویل و عریض شامیانہ نصب کیا گیا جس کے نیچے خلیفہ المستنصر باللہ، ملک ظاہر بیبرس، قاضی القضاۃ، اراکین دولت، مشیرانِ سلطنت رؤسائے ملک و ملت اور کثیر تعداد میں عوام مجتمع ہوئے۔ امیر فخر الدین بن لقمان نے منبر پر کھڑے ہو کر خلیفہ کی طرف سے الملک الظاہر سلطان رکن الدین بیبرس کے لیے شرعی نیابت کی سند پڑھی اس میں حمد و ثنا کے بعد خلیفہ کے استحقاقِ خلافت سلطان کی خدمات کا اعتراف اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا تھا اور آخر میں نظامِ حکومت معدلت گستری اور رعایا کی فلاح و بہبود کے بارے میں ہدایات درج تھیں اسی اجتماع میں خلیفہ نے اپنے ہاتھ سے سلطان کو سیاہ خلعت اور سیاہ عمامہ پہنایا پھر تمام مملکت کا نظم و نسق سلطان کے حوالے کر کے اسے "امیر المومنین" کا لقب دیا۔

المستنصر باللہ کی گمشدگی

قیامِ خلافت کے چند ماہ بعد خلیفہ المستنصر باللہ اور سلطان بیبرس کے دل میں

خیال پیدا ہوا کہ بغداد اور عراق کے دوسرے علاقوں کو تاتاریوں سے واپس لیا جائے اور خلیفہ خود اس مہم کی قیادت کرے چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک فوج گراں تیار کی گئی کہا جاتا ہے کہ سلطان نے اس فوج کے ساز و سامان پر دس لاکھ دینار صرف کیے ایک مقررہ تاریخ کو خلیفہ اس فوج کو ساتھ لے کر عراق کی طرف روانہ ہوا۔ سلطان بھی دمشق تک خلیفہ کے ساتھ گیا اور پھر اس کی اجازت سے واپس قاہرہ آ گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے ہزاروں دینار خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کو بطور زادِ راہ دیے۔ دمشق سے خلیفہ نے اپنے لشکر کے ساتھ بغداد کا عزم کیا۔ بدقسمتی سے تاتاریوں کو اس کی پیش قدمی کی اطلاع مل گئی چنانچہ وہ جونہی ہیت کے مقام سے آگے بڑھا تاتاریوں کا ایک زبردست لشکر اس پر ٹوٹ پڑا۔ خلیفہ اور اس کی فوج نے مردانہ وار مقابلہ کیا لیکن تاتاریوں کی کثیر جمعیت کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی۔ سینکڑوں مسلمان شہید ہو گئے اور جو باقی بچے وہ منتشر ہو گئے۔ اس ہنگامے کے بعد خلیفہ کا کچھ پتہ نہ چلا نہ اس کو کسی نے بھاگتے دیکھا اور نہ اس کی لاش ہی مقتولوں میں ملی۔ تاہم اکثر مورخین کا خیال ہے کہ وہ شہید ہو گیا۔ یہ واقعہ ۳ محرم الحرام ۶۶۰ھ کا ہے اس حساب سے خلیفہ المستنصر باللہ کی خلافت تقریباً چھ ماہ رہی۔ اس حادثہ کی خبر مصر پہنچی تو سلطان اور اہلِ مصر کو سخت صدمہ پہنچا۔ سلطان نے حکم دیا کہ خلیفہ کی سرگرمی سے تلاش کی جائے کئی ماہ تک یہ تلاش جاری رہی جب المستنصر باللہ کے ملنے سے مایوسی ہو گئی تو سلطان نے ایک دوسرے عباسی شہزادے ابو العباس احمد کو شام سے قاہرہ بلا بھیجا۔

ابوالعباس احمد

ابوالعباس احمد کا سلسلۂ نسب بغداد کے انتیسویں عباسی خلیفہ المسترشد باللہ سے ملتا تھا۔ امام سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں اس کا سلسلۂ نسب اس طرح درج کیا

ہے۔ "ابو العباس احمد بن ابو علی الحسن القبیؒ بن علی بن ابو بکر بن المسترشد باللہ بن المستظہر باللہ ۔ ۔ ۔ ۔" بغداد پر تاتاریوں کی یلغار کے وقت وہ کہیں چھپ گیا تھا[1] اور پھر موقع پا کر عربوں کی ایک جماعت کے ساتھ حسین بن فلاح امیر بنی خفاجہ کے پاس چلا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں سے شام چلا گیا اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ

"ملک ظاہر بیبرس نے احیاءِ خلافت کے سلسلے میں ابو القاسم احمد اور ابو العباس احمد دونوں کو مصر بلا بھیجا تھا لیکن ابو القاسم احمد پہلے پہنچ گیا اور المستنصر باللہ کے لقب سے خلیفہ بن گیا۔ ابو العباس احمد نے راستے میں یہ خبر سنی تو حلب چلا گیا وہاں والیٔ حلب اور دوسرے لوگوں نے اس کی بیعت کر لی اور "الحاکم بامر اللہ" کا لقب دے کر اپنا خلیفہ بنا لیا۔"

ابو العبّاس احمد ایک مجاہد شخص تھا اور تاتاریوں کے خلاف کئی لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا اسی غرض سے وہ حلب سے غازی گیا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں خلیفہ المستنصر باللہ بھی تاتاریوں سے جہاد کرنے کے لیے قاہرہ سے غازی آیا۔ خاندانِ عباسی کے دونوں فرزندوں کی ملاقات ہوئی تو ابو العباس احمد اپنی خلافت سے دستبردار ہو گیا اور المستنصر باللہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ خلیفہ المستنصر باللہ کی گمشدگی کے وقت ابو العباس احمد دمشق کے سربرآوردہ امیر عیسیٰ بن مہنا کے پاس مقیم تھا۔ ایک سال بعد اس کو سلطان بیبرس کی طرف سے قاہرہ آنے کی دعوت موصول ہوئی تو وہ بلا تاخیر اپنے بیٹوں اور رفیقوں کے ساتھ قاہرہ پہنچ گیا۔

---

[1] بعض روایتوں میں ہے کہ ابو العباس احمد بھی ابو القاسم احمد کی طرح قید خانے میں تھا۔ جب قیدی چھوٹ کر بھاگے تو وہ بھی ان کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔

مصر کا دوسرا عباسی خلیفہ

سلطان بیبرس نے ابوالعباس احمد کا بھی نہایت سج دھج اور دھوم دھام سے استقبال کیا اور اس کو کمال اعزاز و احترام کے ساتھ قلعہ سلطانی کے بڑے برج میں اتارا۔ حسب قاعدہ ابوالعباس احمد کے خاندان خلافت سے ہونے پر شہادتیں لی گئیں۔ جب سب لوگوں کے نزدیک اس کے نسب کی تصدیق ہو گئی تو سلطان نے جمعرات ۸ محرم ۶۶۱ھ کو قلعہ سے علیحدہ دربار عام منعقد کیا۔ ابوالعباس احمد قلعہ کے ایوان سے اٹھ کر دربار میں گیا۔ سلطان نے اٹھ کر زمین بوسی کی اور اس کی خلافت کا اقرار کر کے بیعت کی۔ خلیفہ نے اس کو خلعت عنایت کیا۔ اس کے بعد تمام شرکائے دربار نے حسب مراتب خلیفہ کی بیعت کی اور اس کو "الحاکم بامر اللہ" کا لقب دیا۔ یہ وہی لقب تھا جو اس نے کچھ عرصہ پہلے حلب کی مسند خلافت پر بیٹھ کر اختیار کیا تھا۔

دوسرے روز جمعہ تھا اس میں حاکم نے ایک طویل خطبہ پڑھا جس کو اس طرح شروع کیا۔

"خدا کی حمد جس نے آل عباس کے لیے ایک مددگار کھڑا کیا۔"

اس کے بعد اس نے جہاد فی سبیل اللہ اور خلافت کی اہمیت اور فضیلت بیان کی پھر خلافت کی جو بے حرمتی ہوئی تھی اس کا ذکر کیا اور لوگوں کو عبرت دلائی۔ آخر میں اس نے ملک ظاہر بیبرس کے متعلق کہا کہ

"جب دشمن ہمارے گھروں میں گھس آئے تھے اور انہوں نے قیامت کے فتنے برپا کر رکھے تھے ایسے نازک وقت میں سلطان رکن الدین بیبرس اپنی چھوٹی سی سلطنت کے باوجود امت مسلمہ کی امداد و اعانت کے لیے اٹھا اور اس نے کفر کے لشکروں کو منتشر کر کے رکھ دیا۔"

اس خطبہ کے بعد تمام مملکت میں الحاکم بامر اللہ کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔

سلطان بیبرس نے اپنے قصر کبیر میں ایک محل خلیفہ کی سکونت کے لیے مخصوص کر دیا اور اس کی تمام ذاتی ضروریات اور لوازمِ خلافت کا انتظام کر دیا۔

سلطان نے اپنی زندگی میں ہمیشہ احترامِ خلافت ملحوظ رکھا لیکن سیاسی قوت آخر دم تک اپنے ہاتھ میں رکھی۔ ایک دفعہ اس کو معلوم ہوا کہ لوگ خلیفہ کے پاس آزادانہ جا کر بیٹھتے ہیں اور پھر قصرِ خلافت سے باہر نکل کر لایعنی باتیں اڑاتے پھرتے ہیں تو اس نے ایک فرمان کے ذریعہ حکم دیا کہ کوئی شخص اس کی اجازت کے بغیر خلیفہ کے پاس جا کر نہ بیٹھے۔ اسی فرمان کی بنا پر عام مؤرخین نے لکھا ہے کہ "مصر میں عباسی خلیفہ کی حیثیت محض ایک نظر بند قیدی کی تھی جو عزلت نشینی کی زندگی کا خوگر تھا اور قلعہ میں نظر بند رہتا تھا۔ وہ کسی سیاسی اقتدار کا مالک نہ تھا اور سلطانِ مصر کے رحم و کرم پر جیتا تھا۔"

خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے کچھ اوپر چالیس سال تک خلافت کی اور اس طویل عرصے میں متعدد سلطانوں کی حکومت دیکھی۔ اس نے ۱۸ (یا ۱۲) جمادی الاولیٰ ۷۰۱ھ کو بعہدِ سلطان محمد بن قلاوون وفات پائی۔ عصر کے وقت قلعہ کے نیچے نمازِ جنازہ پڑھائی گئی تمام امراء اور ارکانِ دولت ازراہِ ادب ننگے پاؤں جنازہ کے ہمراہ گئے اور سیدہ نفیسہ کے مزار کے قریب اس کو دفن کیا۔ اس مقام پر سب سے پہلے الحاکم ہی دفن ہوا۔ اس کے بعد یہ مقام اس کے خاندان کا مدفن ہو گیا۔

مصر میں عباسی خلافت مملوک حکومت کے خاتمہ (۹۲۳ھ) تک قائم رہی اس کے بعد منصبِ خلافت ترکوں کو منتقل ہو گیا۔

خارجہ حکمتِ عملی

فارن پالیسی

(FOREIGN POLICY
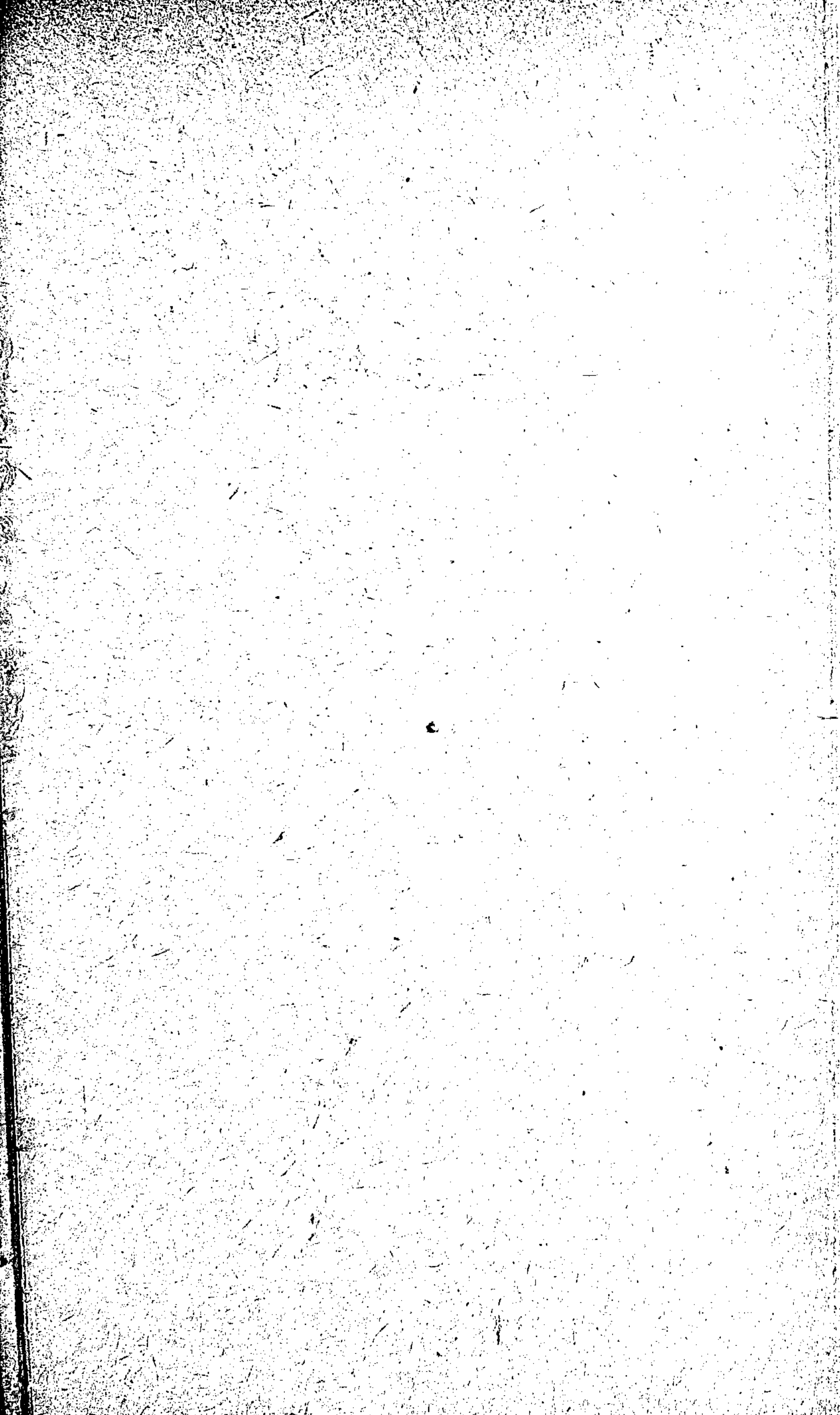
تین عالمی طاقتیں

جس زمانہ میں ملک ظاہر بیبرس نے مصر و شام کی عنانِ اقتدار سنبھالی، عالمی سیاست نہایت پیچیدہ تھی۔ اجمالی طور پر اس کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے کہ اُس وقت تین طاقتیں مشرق و مغرب پر چھائی ہوئی تھیں۔

۱۔ تاتاری۔

۲۔ یورپی ملکوں کے عیسائی حکمران ارضِ شام و فلسطین کی صلیبی ریاستیں اور قسطنطنیہ کی بیزنطینی حکومت۔

۳۔ مسلمان۔

یہ تینوں طاقتیں بھی اپنے اپنے دوائر میں متحد اور مربوط نہیں تھیں بلکہ کئی دھڑوں میں بٹی ہوئی تھیں جن میں سے ہر ایک کا طریقِ کار اور اندازِ نظر مختلف تھا۔ بیبرس نے اپنی خارجہ حکمتِ عملی کی تشکیل جن خطوط پر کی اس کا پس منظر جاننے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں ان تینوں طاقتوں کے حالات کا اجمالی جائزہ لیا جائے۔

۱۔ تاتاری ـــــ شروع شروع میں تاتاریوں میں کامل اتحاد تھا۔ اسی اتحاد کی بدولت انہوں نے پہلے فاتح اعظم چنگیز خاں کی قیادت میں اور اس کے بعد قبلائی خاں۔ ہلاکو اور دوسرے مغل سرداروں کی قیادت میں ایک دنیا کو زیر و زبر کر ڈالا تھا۔ ان کی ہولناک یلغار، جس کو فتنۂ تاتار سے موسوم کیا جاتا ہے مسلمانوں کے لیے خاص طور پر تباہی کا پیغام لائی تھی۔ اس نے عظیم خوارزم شاہی سلطنت اور بغداد کی عباسی خلافت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی تھی۔ مفتوحہ علاقوں سے تباہ حال مسلمانوں

کے قافلے (جو کسی طرح تاتاریوں کی خون آشامی کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئے تھے) دھڑا دھڑ مصر پہنچ رہے تھے۔ اگر عین جالوت کے معرکے میں بیبرس تاتاریوں کے دانت نہ توڑ دیتا تو مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے لیے شاید ہی کوئی جائے پناہ باقی رہ جاتی۔ ہیرلڈلیم نے "تاتاریوں کی یلغار" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ اگر کہیں مصر پر مغلوں کا قبضہ ہو جاتا تو مسلمان فوجوں کے لیے عرب کے ریگستان اور شمالی افریقہ کے گمنام ساحل کے علاوہ دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہتا۔

سلطان بیبرس نے برسرِ اقتدار آ کر تاتاریوں کی متحدہ طاقت سے نبرد آزما ہونے کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع کر دیں اُدھر قدرت نے اس کی یُوں امداد کی کہ اسی زمانے میں تاتاریوں میں دھڑے بندی پیدا ہو گئی اور ان کی ہولناک قوت کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی ان میں اہم حصے یہ تھے:

ا۔ چین کا یوئن (Yven) خاندان۔ ان کا دارالخلافہ خان بلغ (موجودہ پیکنگ) تھا

ب۔ ایل خانی ــــ اس کا سربراہ ہلاکو تھا۔ ایل خانیوں کی حکومت میں فارس، عراق اور ارضِ روم وغیرہ کے علاقے شامل تھے اور ان کی وسیع مملکت لاکھوں مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ ایل خانی حکومت کا دارالسلطنت مراغہ (آذربائیجان) تھا

ج۔ خوانین زرّیں خیل یا خیام زریں[1] (Golden Horde)

ان کا سربراہ برکہ خاں (Bereke)[2] تھا جو خوش قسمتی سے شہزادگی کے

---

[1] ان مغل قبائل کے خیمے سنہرے رنگ کے ہوتے تھے اس لیے ان کو خیام زرین یا زرّیں خیل کہتے تھے اور ان کی سلطنت کو "اردوئے زریں" سے موسوم کیا جاتا تھا۔

[2] مؤرخین نے یہ نام مختلف طریقوں سے لکھا ہے۔ برکہ۔ برکا۔ برقہ۔ برک اور برقائی ہم نے برکہ کو ترجیح دی ہے۔

ہی میں مسلمان ہو گیا تھا۔ وہ مغل بادشاہوں میں سب سے پہلا شخص تھا جو اسلام لایا۔ اس کو حلقۂ اسلام میں لانے کا سہرا سمرقند و بخارا کے اُن مسلمان تاجروں کے سر ہے جو تجارت کے سلسلے میں مغلوں کے علاقوں میں اکثر آیا کرتے تھے۔ برکہ خاں ان کے اخلاق سے بڑا متاثر ہوا اور اس کے دل میں ان لوگوں کے مذہب کا حال جاننے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا جو بخارا سے آیا تھا اس کاروان میں دو مسلمان تاجر بڑے عالم و فاضل تھے برکہ خاں نے ان سے اسلام کے متعلق کچھ سوالات دریافت کیے انہوں نے اسلام کی صداقت، حقانیت اور اس کے احکام و اصول ایسی عمدگی سے بیان کیے کہ برکہ خاں فوراً ان کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو گیا۔ ایک عیسائی مورخ کا بیان ہے کہ ۱۲۶۰ھ میں علامہ نجم الدین مختار الزاہدی نے برکہ خاں کے لیے ایک کتاب لکھی جس میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت دلائل اور براہین کے ذریعے ثابت کی تھی اور اس میں اسلام اور عیسائیت کا محاکمہ بھی کیا تھا۔ برکہ خاں اسلام کا نہایت پرجوش مبلغ ثابت ہوا اور اس کے زیر اثر ہزاروں مغلوں نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ باتو خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی سلطنت "اردوئے زریں" خوارزم مغربی قبچاق اور روس کے لاکھوں مربع میل پر محیط تھی۔ مشرقی قبچاق کا حکمران خاندان اردا۔ بلغاریہ کا حکمران خاندان تکا تیمور اور کرغیز کا حکمران خاندان شیبان بھی ایک حد تک اس کے ماتحت تھے۔ دریائے والگا پر ایک شہر "سرائے" برکہ خاں کا دارالحکومت تھا۔

د۔ چغتائی خاندان ۔ یہ ماوراء النہر کے حکمران تھے۔

سلطان بیبرس کو صرف ایل خانی اور زریں خیل حکمرانوں سے سابقہ پڑا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

۲۔ یورپ اور ارضِ مشرق کے عیسائی حکمران ـــــ یورپ اور ارضِ مشرق میں سلطان کی ہم عصر اہم عیسائی سلطنتیں یہ تھیں۔

۱۔ فرانس۔
۲۔ انگلستان۔
۳۔ اطالیہ و صقلیہ۔
۴۔ وینس
۵۔ جینوا۔
۶۔ قسطنطنیہ کی بیزنطینی سلطنت۔
۷۔ ارضِ شام و فلسطین کی صلیبی ریاستیں۔

ان کے علاوہ پاپائے روم مذہبی اعتبار سے عیسائی دنیا میں زبردست قوت اور اثر و رسوخ کا مالک تھا۔

۲۔ مسلمان — سلطان کی معاصر مسلم حکومتوں میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ ہندوستان (خاندانِ غلاماں — سلطان ناصر الدین محمودؒ اور غیاث الدین بلبنؒ سلطان بیبرس کے ہم عصر تھے۔)
۲۔ مراکش (موحدین — مرین خاندان)
۳۔ الجزائر (زیانی خاندان)
۴۔ تیونس (حفصیین)
۵۔ ہسپانیہ کی نصری حکومت غرناطہ)
۶۔ حجاز، خاندانِ قتادہ
۷۔ یمن رسولیین
۸۔ ارضِ روم (قونیہ) سلاجقہ (قتلمش کے جانشین)
۹۔ فارس (شیراز) سلغری خاندان (اتابک ابوبکر بن سعد زنگی)
۱۰۔ موصل زنگی خاندان (اتابک بدر الدین لولو)

بین الاقوامی سیاست کا نقشہ

اوپر ہم نے سلطان بیبرس کی اہم معاصر سلطنتوں کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس دور کی بین الاقوامی سیاست کا نقشہ یہ تھا۔

ملک الظاہر بیبرس نے تاتاریوں کی ہیبت ناک طاقت کے سامنے تلوار ول کا بند باندھ کر نہ صرف اپنی زبردست شخصیت کا لوہا تمام دنیا سے منوا لیا تھا بلکہ تمام عالم اسلام میں مملکت مصر و شام کو مرکزی اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔ ایل خانی مغل اور ارض مشرق و یورپ کے صلیبی اس کے بدترین دشمن تھے اور انہوں نے مصر و شام کی مملوک حکومت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک دوسرے سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ بیبرس اپنی زبردست قوت کے باوجود یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک طرف اس کے خلاف ایک نئی صلیبی مہم کا آغاز ہو جائے اور دوسری طرف ایل خانی مغل مصر و شام پر ٹوٹ پڑیں اس طرح وہ دو زبردست دشمنوں کے گھیرے میں آ سکتا تھا۔ اس کا تدارک اس نے یوں کیا کہ ایک طرف تو اس نے ایل خانیوں کے طاقتور حریف برکہ خان اعظم " اردوئے زریں " سے گہرے دوستانہ مراسم استوار کیے اور دوسری طرف اطالیہ و سسلی کے حکمران مینفرہڈ، قسطنطنیہ کے بازنطینی قیصر اور وینس و جینوا کی جمہوری ریاستوں سے تجارتی اور دوستانہ معاہدے کیے۔ اس طرح اس نے تاتاریوں اور صلیبیوں کی قوت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سلطان کے ہم عصر مسلم فرمانروایان یمن و حجاز نے رسمی طور پر اپنے علاقوں پر مملوک حکومت مصر و شام کا اقتدار تسلیم کر لیا ادھر فارس کے سلغری خاندان اور موصل کے زنگی خاندان نے مسلمان ہونے کے باوجود غیر مسلم ایل خانیوں کی اطاعت قبول کر لی۔ ارض روم کے سلجوقی حکمران بھی تاتاریوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

سلطان کے دوسرے ہم عصر مسلم فرماں رواؤں نے غیر جانب داری کی حکمت عملی کیوں اختیار کی۔ اس کا سبب ان کی ملکی مصلحتیں تھیں یا کچھ اور ۔ مؤرخین نے اس پر روشنی نہیں ڈالی بہر صورت یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان۔ تیونس اور مراکش کی طاقتور مسلم حکومتوں کی طرف سے بیبرس کو کوئی امداد نہ پہنچی اور اپنے طاقتور حریفوں کے خلاف اس کو تمام جنگیں اپنے ہی بل بوتے پر لڑنی پڑیں۔ البتہ اس کے ہاتھ اگر کسی نے مضبوط کیے تو وہ "اردوئے زریں" کا نومسلم تاتاری فرماں روا برکہ خاں تھا۔

اردوئے زرّیں سے دوستانہ تعلقات

سلطان بیبرس کی خارجہ حکمت عملی کا شاہکار اردوئے زرّیں کے نومسلم خانِ اعظم برکہ سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات قائم کرنا تھا اور اس کو اپنے کافر رشتہ داروں یعنی ایران کے ایل خانیوں (ہلاکو اور اس کی اولاد) کا مستقل حریف بنا دیا تھا۔

مغلوں کے قاآن اعظم منگو خاں[۱] کے زمانے (۶۴۶ھ ۱۲۴۸ء تا ۶۵۸ھ ۱۲۶۰ء) میں اگرچہ برکہ اور ہلاکو میں بظاہر اتحاد رہا لیکن در پردہ ان کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ برکہ خاں مشرف باسلام ہو چکا تھا اور قدرتی طور پر اس کو مسلمانوں سے ہمدردی تھی۔ دوسری طرف ہلاکو اپنے آبائی مذہب پر قائم تھا لیکن اپنی عیسائی بیوی دوقوز خاتون[۲] کے زیر اثر اس کا رجحانِ طبع عیسائیوں کی طرف تھا۔ ۱۲۵۵ عیسوی

۱؎ منگو خاں، چنگیز خاں کا پوتا تھا۔

۲؎ دوقوز خاتون، بوئیخوار ترکوں کے قبیلہ کریت کے خان کی بیٹی تھی۔ یہ لوگ نسطوری عیسائی تھے۔ دوقوز خاتون نے ایک قابل حمل ونقل گرجا بنا رکھا تھا جسے اپنے ساتھ لیے پھرتی تھی۔

سے ۱۲۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں ہلاکو نے جو فتوحات حاصل کیں۔ برکہ خاں نے ان کو بڑے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔ جب ہلاکو نے ۶۵۶ھ ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تاخت و تاراج کیا تو برکہ خاں نے ہلاکو کو لکھا۔

"تم نے ایک مقدس مقام کی بے حرمتی کی ہے اور اس معاملے میں پہلے اپنے خاندان کے دوسرے افراد سے مشورہ نہیں لیا۔"

لیکن ہلاکو پر برکہ خاں کی تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا اس نے اس کو خندۂ استہزا کے ساتھ ٹال دیا اور بدستور اپنی مسلم آزارانہ روش پر قائم رہا وہ جن علاقوں کو فتح کرتا وہاں کے مسلمانوں پر بڑی سختیاں کرتا اور عیسائیوں پر الطاف و اکرام کی بارش کرتا۔ چنانچہ عیسائی اس کو اپنا مربی اور سرپرست سمجھتے تھے اور ارمنیوں اور صلیبی جنگ جوؤں کی ایک کثیر تعداد اس کے لشکر میں شامل ہو گئی تھی۔ مؤرخ ہیرلڈلیم لکھتا ہے:

"جدھر جدھر سے ہلاکو خاں کے دستے گزرتے مسجدوں کو آگ لگا دی جاتی اور دھوئیں کے بادل بلند ہوتے لیکن کلیساؤں کو کوئی ہاتھ نہ لگاتا۔"

برکہ خاں کو یہ خبریں پہنچتی تھیں اور وہ ہلاکو کی مسلم دشمنی اور صلیب نوازی پر سخت پیچ و تاب کھاتا تھا۔ اواخر ۱۲۵۹ء (یا اوائل ۱۲۶۰ء) میں قاآن اعظم منگو خاں نے وفات پائی تو برکہ خاں اور ہلاکو خاں کھل کر ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ چنگیز خاں کی اولاد میں قاآن اعظم بنانے کے جو جھگڑے رونما ہوئے، ان میں برکہ نے ایک فریق کا ساتھ دیا اور ہلاکو نے دوسرے کا ـــــ اس طرح ان کے درمیان جو سرد جنگ پانچ سال سے جاری تھی وہ گرم جنگ میں تبدیل ہو گئی اور دونوں طرف کی فوجوں میں جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

ہلاکو کی فوج میں "اردوئے زریں" کے جو دستے شامل تھے ان پر بھی اس چپقلش

کا اثر پڑا ان میں سے کچھ دستے تو دربند کی راہ سے دشتِ قپچاق کو لوٹ گئے اور کچھ براہِ شام، مصر جا پہنچے اور سلطان بیبرس کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ سلطان کو انہی پناہ گیر تاتاریوں سے برکہ خاں اور اس کی عظیم سلطنت کے مفصل حالات معلوم ہوئے۔ سلطان کی دوربین نگاہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ برکہ خاں سے دوستانہ مراسم قائم کرنے میں کتنے فوائد مضمر ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک سفارت مرتب کی اور اس کو قسطنطنیہ کے راستے اردوئے زرّیں کے دار الحکومت "سرائے" کی جانب روانہ کر دیا۔ بدقسمتی سے اس سفارت کو قیصرِ روم نے ہلاکو کی خوشنودی کی خاطر راستے ہی میں روک لیا۔ اسی اثنا میں برکہ خاں کی جانب سے ایک سفارت قاہرہ پہنچ گئی۔ اس نے بیبرس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے خان کی جانب سے اس کو عین جالوت کے معرکہ میں کامیابی حاصل کرنے پر مبارک باد دی اور پھر خان کا یہ پیغام دیا کہ

"ہم مسلمان ہیں اور اپنے کافر رشتہ دار ہلاکو سے لڑ رہے ہیں اس لیے سلطانِ مصر کو چاہیے کہ دریائے فرات کی وادی میں ایلخانی مقبوضات پر چڑھائی کر دے۔"

سلطان کے لیے یہ ایک نہایت خوش آئند پیغام تھا۔ اس کے غیر معمولی فہم و تدبر نے اس کو فوراً یہ بات سجھا دی کہ مغلوں کے خلاف سب سے طاقتور حلیف جو اسے مل سکتے ہیں مغل ہی ہیں چنانچہ اس نے "اردوئے زرّیں" کی سفارت کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سفیروں کو بیش بہا خلعتوں سے نوازا۔ اپنے حلقے میں انہیں اعلیٰ مراتب پر فائز کیا اور عباسی خلیفہ مصر کی رسمی اجازت سے خطبہ میں اپنے اور اس کے نام کے ساتھ برکہ خاں کا نام بھی پڑھوایا۔ پھر اس نے برکہ خاں کے نام ایک طویل خط لکھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خط ستر صفحات پر مشتمل تھا اور سلطان نے اس کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس خط میں سلطان نے کافروں سے جہاد کرنے کے بارے میں قرآن حکیم کی جملہ آیات

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث درج کیں ــــ اور برکہ خاں کو لکھا کہ وہ خود (یعنی بیبرس) بھی دشتِ قپچاق کا رہنے والا ہے اور اب عاجز قپچاقی مسلمان کی حیثیت سے "خیامِ زرّیں" کے عظیم نو مسلم خان کو برادرانہ سلام بھیجتا ہے۔ اس کے لیے یہ بات بڑی مسرّت بخش ہے کہ عظیم برکہ خاں اپنے چچازاد بھائی ہلاکو کی سرگرمیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ہلاکو اسلام کو نیست و نابود کرنے پر تُلا ہُوا ہے اور یہ عاجز بیبرس اسلام کو بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے اس نے خلافت کو مصر میں بحال کر دیا ہے اور اب وہ کافروں کے خلاف جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ یہ عاجز اپنے مسلمان بھائی برکہ خاں کو یہ اطلاع دینے میں مسرت محسوس کرتا ہے کہ قاہرہ کی جامع مسجد میں خلیفۂ عباسی اور اس عاجز کے نام کے ساتھ برکہ خاں کا نام بھی خطبہ میں پڑھا گیا ہے اور خان کی جانب سے ایک متدیّن مسلمان کو حج بدل کے لیے مکہ معظمہ بھیجا گیا ہے۔ یہ عاجز اور مصر و شام کے مسلمان خان کے بیحد ممنون ہوں گے اگر وہ عقب سے کافر ہلاکو کی فوجوں پر حملہ کر دے۔

یہ خط دے کر سلطان نے اردوئے زرّیں کی سفارت کو نہایت عزّت و احترام کے ساتھ رخصت کیا[1] اور اس کے ساتھ اپنے کچھ سفیر بھی بہت سے قیمتی تحائف دے کر روانہ کیے۔ مؤرخین نے ان تحائف کی بڑی طویل فہرست دی ہے ان میں سے کچھ کی تفصیل یہ ہے:

قرآن پاک کا ایک نادر نسخہ جس پر خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ ابن عفان کی مُہر لگی ہوئی تھی۔ اس کے ریشمی (زربفت کے) غلاف پر سُنہرا کام تھا۔ ہاتھی دانت

---

[1] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ سلطان نے اس سفارت کے کچھ اراکین کو بمنت قاہرہ میں روک لیا تاکہ وہ اس کی فوج کو مغلوں کی جنگی ترکیبیں سکھائیں۔

اور آبنوس (یا صندل) سے بنایا ہوا ایک مرصّع تخت۔ کئی منقّش اور زرتار مصلّے اور جانمازیں۔ چاندی کی طشتریاں۔ نقرئی دستوں کی نفیس تلواریں۔ خوارزم کی زینیں۔ ریشم کی ڈوری والی دمشقی کمانیں۔ نیزے۔ تیر ترکش۔ مختلف رنگوں کے نفیس پردے شمعدان۔ تکیے۔ تکیوں کے خوبصورت غلاف۔ گاؤ تکیے۔ سنگی دیگیں۔ نمدے۔ سدھائے ہوئے بندر جن کو ریشمی کپڑے پہنائے ہوئے تھے۔ تازی گھوڑے جنگلی گدھے۔ زرافے۔ صبا رفتار اشتر۔ اعلیٰ درجے کے طوطے۔ حبشی غلام خواجہ سرا اور تربیت یافتہ کنیزیں۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ان تحائف میں وہ دستار بھی شامل کر دی گئی تھی جس کو باندھ کر ایک مصری نے برکہ خاں کی طرف سے حج بدل کیا تھا۔ یہ مصری حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر سفارت کے روانہ ہونے سے پہلے ہی قاہرہ واپس آ گیا تھا۔

قیصر روم نے مصر کی پہلی سفارت کو قسطنطنیہ میں روک رکھا تھا اس لیے خدشہ تھا کہ وہ اس سفارت کو بھی روک لے گا۔ سلطان نے اس خطرے کا سدّ باب کرنے کے لیے قیصر روم کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مصر کی سفارت کو روکا تو وہ اپنی مملکت میں تمام بیزنطینی تاجروں کو گرفتار کر لے گا اور قسطنطنیہ سے اپنے تمام تجارتی تعلقات ختم کر دے گا اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی مملکت کے عیسائی طریقوں سے قیصر روم کو دھمکی دلائی کہ وہ اس کو کلیسا کا اسقفِ اعظم تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے۔ سلطان کی اس کارروائی سے قیصر کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور اس نے دونوں سفارتوں کو اردوئے زرّین کی طرف جانے کی اجازت دے دی۔

مصری سفیر سرائے پہنچے تو برکہ خاں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا سلطان بیبرس کا مکتوب اور تحائف موصول کر کے اس کو بے اندازہ مسرّت ہوئی۔ اس نے سلطان کو تشکر کا پیغام بھیجا اور اپنے پورے تعاون اور مدد کا یقین دلایا اس طرح ان

دونوں عظیم مملکتوں کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم قائم ہو گئے۔ برکہ خاں کا دارالحکومت سرائے اس وقت تک سنہری خیموں کا شہر تھا۔ اس نے سلطان بیبرس کو پیغام بھیجا کہ وہ مصر سے کاریگر اور صنّاع بھیجے جو اینٹ اور پتھر کی عمارتیں تعمیر کریں۔ سلطان نے فوراً بہت سے معمار۔ صنّاع اور دوسرے ارباب کمال "سرائے" بھیج دیے جنھوں نے چند سال کے اندر اندر اس شہر میں بے شمار مکانات۔ محلّات۔ مدارس۔ مساجد۔ سرائیں اور مہمان خانے تعمیر کر دیے۔ اس طرح سلطان بیبرس کی بدولت خانہ بدوش مغل نئے تمدن سے روشناس ہوئے۔ برکہ خاں کے تخت نشین ہونے کے بعد سمرقند اور بخارا وغیرہ سے بہت سے مسلمان جن میں کئی علماء بھی شامل تھے سرائے آکر آباد ہو گئے تھے۔ خان کے ایماء پر ان لوگوں نے اردوئے زرّیں کے مغل قبائل میں بڑے زور شور سے اسلام کی تبلیغ کی نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔

پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب "پریچنگ آف اسلام" میں لکھتا ہے کہ

> "برکہ خاں کے تمام امرائے دولت اور شہزادوں و شہزادیوں کے ہاں نماز پڑھانے کے لیے ایک ایک امام اور اذان دینے کے لیے ایک ایک مؤذن مقرر تھا اور سلطنت کے تمام شہروں میں مکتب قائم کیے گئے تھے جن میں عام رعایا کے بچّوں کو قرآن پاک پڑھایا جاتا تھا۔"

جب سلطان بیبرس اور برکہ خاں میں اتحّاد قائم ہوا تو سلطان کے ایماء پر بہت سے مصری اور شامی علماء بھی "اردوئے زرّیں" گئے اور وہاں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ دوسری طرف "اردوئے زرّیں" سے مغلوں کی ایک کثیر تعداد برکہ خاں کی اجازت سے مصر آکر آباد ہو گئی۔ ان لوگوں نے سلطان کی تبلیغ سے اسلام قبول کر لیا اور اپنے آپ کو نہایت اچھا شہری ثابت کیا۔

برکہ خاں کی بروقت امداد

برکہ خاں سے سلطان بیبرس کے حلیفانہ تعلقات کے نتائج بڑے دُور رس ثابت ہوئے۔ عین جالوت میں تاتاری لشکر کی ذلت آمیز شکست نے ہلاکو کو شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا اور وہ مصر کا سر کچلنے کے لیے بے تاب تھا۔ بیبرس بھی ہلاکو کے عزائم سے غافل نہیں تھا۔ وہ اس کو دنداں شکن جواب دینے کے لیے دن رات تیاری کرتا تھا۔ اس نے ایک جرار لشکر کو ہر قسم کے آلاتِ حرب و ضرب سے لیس کر دیا تھا اور اس کو ایسے ڈھنگ سے تربیت دی تھی کہ وہ تاتاریوں کے سیلِ بلا سے مؤثر طور پر نبٹ سکے۔ اس لشکر میں تاتاری نسل کے (مسلمان) مملوک نہایت کثرت سے بھرتی کیے گئے تھے ان کا دعویٰ تھا کہ وہ کافر مغلوں کو لوہے کے چنے چبوا سکتے ہیں اس زمانے میں سلطان شام کے مختلف علاقوں میں برق رفتاری سے گشت کرتا رہتا تھا۔ وہ جہاں منزل کرتا رات کو اپنے خیمے میں فوجی لباس ہی میں سو جاتا اور ایک رات سے زیادہ کسی جگہ قیام نہ کرتا اس کے خیمے پر ہر وقت ایک صبا رفتار گھوڑا جس پر زین کسی ہوتی تیار کھڑا رہتا تاکہ جس وقت بھی مغلوں کے حملے کی اطلاع ملے وہ ان کے مقابلے میں بلا تاخیر پہنچ جائے۔ اس نے حلب سے لے کر وادیٔ فرات تک ساری گھاس جلوا دی درخت کٹوا دیے اور سرحدی گاؤں خالی کرا لیے تاکہ مغلوں کو نہ غذا مل سکے اور نہ ان کے گھوڑوں کو چارہ۔ دوسری طرف اس نے اپنے طاقتور حلیف برکہ خاں کو ہلاکو خاں کے لشکر پر عقب سے حملہ کرنے پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۲۶۲ء کے جاڑوں میں جب ہلاکو خاں نے مصر و شام پر یلغار کرنے کی تیاری کی تو اردوئے زرّیں" کی ایک زبردست فوج قفقاز کے دروں کے نیچے نمودار ہوئی اور ہلاکو کے لشکر سے الجھ گئی۔ اس طرح ایل خانیوں اور زرّیں خیلوں کی طاقتور مغل

سلطنتوں کے درمیان جھڑپوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ گو اس جنگ سے کسی سلطنت کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا کیونکہ ان کے رقبے اس قدر وسیع تھے کہ ایک کے لیے دوسری کو زیر کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ تاہم اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایل خانی مغل مصر و شام پر یلغار کرنے کے قابل نہ رہے۔ ہلاکو بحیرۂ خزر کے مشرق اور مغرب میں دونوں طرف اپنی اندرونی سرحد کی حفاظت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ بخارا اور سمرقند کے راسخ العقیدہ اور جنگجو مسلمانوں نے برکہ خاں کی حمایت میں جہاد کا اعلان کر کے اس کی پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔

ہلاکو کی شاطرانہ چال اور اس کا توڑ

ہلاکو نے اب سپٹا کر عیسائی دنیا سے اپنے حلیف تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس نے قسطنطنیہ کے بیزنطینی شہنشاہ (قیصر روم) کو ایک لچھے دار خط لکھا جس میں اس کی لڑکی میریا (یا مریم) کا رشتہ اپنے لڑکے اباقا خان کے لیے مانگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شاہِ انگلستان اور پاپائے روم کو چٹھیاں لکھیں کہ ہمیں مصر کے خلاف متحد ہو جانا چاہیئے۔ قیصر روم نے تو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہلاکو کی تجویز منظور کر لی[1] لیکن شاہِ انگلستان اور پاپائے روم اپنے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا تھے انہوں نے ہلاکو کو کوئی حوصلہ افزا جواب نہ دیا ــــ ادھر سلطان بیبرس ہلاکو کے سیاسی داؤ پیچ پر کڑی نظر رکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً برکہ خاں کو پیغام بھیجا

---

[1] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ قیصر روم نے اپنی لڑکی ماریا (یا مریم) کو مراغہ کی طرف روانہ کیا تاکہ ہلاکو خاں اس سے شادی کرے۔ یہ لڑکی ابھی راستے ہی میں تھی کہ ہلاکو خاں فوت ہو گیا۔ جب وہ مراغہ پہنچی تو ہلاکو کے بیٹے اباقا خاں نے اسے اپنی بیوی بنا لیا۔

کہ وہ بھی اپنے بھتیجے نوگائی کے لیے قیصر کی دوسری لڑکی کا رشتہ طلب کرے برکہ خاں نے اس کی تجویز پر عمل کیا۔ قیصر کو اردوئے زرّیں کے طاقتور خان کا پیغام ردّ کرنے کی جرأت نہ پڑی اور اس نے اپنی دوسری لڑکی نوگائی سے بیاہ دی۔ اس کے ساتھ ہی بیبرس نے قیصر روم سے ایک تجارتی معاہدہ کر لیا جس کی رُو سے دونوں ملکوں کے تاجر ایک دوسرے کی بندرگاہوں میں آجا سکتے تھے۔ اس طرح بیبرس نے قیصر روم کو عالمی سیاست میں بالکل غیر جانبدار بنا دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد (۱۲۶۴ء میں) ہلاکو اور اس کی عیسائی بیوی دوقوز خاتون یکے بعد دیگرے مر گئے۔ عیسائی مؤرخ لکھتے ہیں کہ ان دونوں کو چالاک مسلمانوں نے زہر دیا کیونکہ وہ عالم اسلام کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کو زہر دینے میں سلطان بیبرس کا ہاتھ تھا۔ غیر جانبدار مؤرخین کے نزدیک وہ دونوں طبعی موت مرے۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو عیسائیوں نے ہلاکو اور اس کی بیوی کے مرنے پر بڑا سوگ منایا۔ عیسائی مؤرخ ابن العبری[1] نے، جو سلطان بیبرس کا ہم عصر تھا، اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ساری عیسائی دنیا کو عیسائی دنیا کے ان دونوں محافظوں اور رہنماؤں کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔"

ایک دوسرے عیسائی مؤرخ اسٹیفن ارفلین نے ہلاکو کی وفات کا ماتم ان

---

[1] گریگوریوس یوحنا ابوالفرج بن ہارون معروف بہ ابن العبری مغرب میں بارہیبریس (Barhebraeus) کے نام سے مشہور ہے۔ ۶۲۳ھ/۱۲۲۶ء میں بمقام ملطیہ پیدا ہوا اور ۶۸۵ھ/۱۲۸۶ء میں مراغہ میں وفات پائی۔ وہ عیسائیوں کے فرقہ یعقوبیہ سے تعلق رکھتا تھا اور اپنے دور کا نامور مؤرخ اور طبیب تھا۔ اس نے عربی اور سریانی میں تیس سے اوپر کتابیں تالیف کی تھیں ان میں سے "تاریخ مختصر الدول" نے بڑی شہرت پائی۔

الفاظ میں کیا ہے:

"شہنشاہ، دنیا کا مالک، عیسائیوں کا آسرا ۱۲۶۴ء میں مرگیا اور اس کے بعد اس کی بیوی دوقوز خاتون نے وفات پائی۔ نیکی میں ان کا مرتبہ قسطنطین اور اس کی ماں ہیلن سے کم نہیں۔"

ہلاکو کی موت کا ذکر تو ضمناً آگیا ورنہ وہ کچھ مدت اور زندہ بھی رہتا تو اس سے چنداں فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ سلطان بیبرس نے اپنی حیرت انگیز خارجہ حکمت عملی کی بدولت سلطنت مصر و شام کو اس غارت گر اعظم کی دستبرد سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا تھا۔

سلطان بیبرس اور عیسائی دنیا

سلطان اگرچہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھا لیکن عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے خلاف اس کے دل میں تعصب کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے ممالک محروسہ میں عیسائی آبادی کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ ان لوگوں کو فوجی خدمت سے استثنا کے عوض جزیہ کی ایک معمولی رقم حکومت کو ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس کے سوا ان کو شہریت کے مکمل حقوق حاصل تھے وہ اپنی مذہبی رسوم نہایت آزادی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ مملکت میں ان کے بے شمار گرجے اور راہب خانے موجود تھے حکومت مساجد کی طرح ان عبادت گاہوں کی بھی پوری حفاظت کرتی تھی۔ ان گرجوں اور راہب خانوں میں پادریوں نے اپنی درس گاہیں قائم کر رکھی تھیں وہاں اُن کو اپنے مذہب کے مطابق تعلیم دینے کی مکمل آزادی تھی۔

سلطان کی اس رواداری کے باوجود ارض مشرق کے صلیبی، جنھوں نے لبنان شام اور فلسطین کے کئی علاقوں (بالخصوص ساحلی بندرگاہوں) پر غاصبانہ قبضہ کرکے اپنی ریاستیں قائم کر رکھی تھیں، اس کے بدترین دشمن تھے اور ہر وقت یورپ کے

اسلام دشمن حکمرانوں اور ایل خانی مغلوں سے ساز باز میں مصروف رہتے تھے سلطان نے ان شریر النفس صلیبیوں کے عزائم کو بھانپ لیا تھا اور شام فلسطین اور لبنان کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ان صلیبیوں کو پاپائے روم اور شاہانِ فرانس و انگلستان کی خاص سرپرستی حاصل تھی۔ اس لیے ان متعصب حکمرانوں سے دوستانہ روابط کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ البتہ بیزنطینی فرماں روا "قیصرِ روم" کے رویہ میں کسی حد تک لچک تھی۔ چنانچہ سلطان نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے اس کو غیر جانبدار رہنے پر مجبور کر دیا تھا (اس کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے)۔ وینس اور جینوا کی عیسائی جمہوریتوں کو مذہبی لڑائیوں میں الجھنے کی نسبت اپنے تجارتی مفادات زیادہ عزیز تھے چنانچہ سلطان نے ان سے تجارتی معاہدے کر کے دوستانہ روابط قائم کر لیے تھے ان دونوں ریاستوں میں شدید تجارتی رقابت تھی لیکن دونوں ہی سلطان کو اپنا حقیقی دوست تصور کرتی تھیں۔ مغربی مؤرخین نے اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے جسے انہوں نے سلطان کی "ڈپلومیسی" سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ان دونوں ریاستوں کے تعلقات سخت کشیدہ ہو گئے۔ فریقین نے سلطان سے درخواست کی کہ وہ ثالث بن کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کرا دے۔ سلطان نے اس معاملے میں ایسا رویہ اختیار کیا کہ دونوں ریاستوں میں صلح ہونے کے بجائے جنگ چھڑ گئی اور ان کے بحری بیڑے بحیرۂ روم میں ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔ معلوم نہیں مغربی مؤرخین کے اس بیان میں کس حد تک صداقت ہے تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان دونوں متحارب ریاستوں کے تعلقات سلطان سے بدستور دوستانہ رہے۔

ان واقعات سے چند سال پہلے عیسائی دنیا سے روابط کے سلسلے میں سلطان عالمی بساطِ سیاست پر ایک اور مہرہ پھینک چکا تھا۔ برسرِ اقتدار آنے کے کچھ عرصہ بعد

اس کو اپنے وقائع نگاروں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اطالیہ وصقلیہ کے فرماں روا مینفریڈ اور پاپائے روم میں اَن بَن ہے یہاں تک کہ پوپ نے اس کو کلیسا سے خارج کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ مینفریڈ ایک علم دوست اور مسلم نواز حکمران ہے اس نے اپنی مملکت کے مسلمان باشندوں کو نہ صرف کامل مذہبی آزادی دے رکھی ہے بلکہ کئی مسلمانوں کو اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز کر رکھا ہے ــــ سلطان نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے میں مطلق تامل نہ کیا اور ۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء میں اپنی مملکت کے ایک سر برآوردہ عالم قاضی جمال الدین ابو عبداللہ محمد بن سالم معروف بہ ابن واصل کی سرکردگی میں ایک دوستانہ سفارت شاہ مینفریڈ کے دربار میں بھیجی۔ بادشاہ نے اس سفارت کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور وہ کافی عرصہ اطالیہ میں مقیم رہی (اس کی کسی قدر تفصیل اس کتاب میں ایک دوسری جگہ ابن واصل کے ترجمہ میں دی گئی ہے) اس طرح مصر کی مملوک حکومت اور حکومت اطالیہ وصقلیہ میں دوستانہ مراسم قائم ہو گئے[1]

---

[1] شاہ مینفریڈ جب تک زندہ رہا، سلطان بیبرس اور اس کے درمیان نہایت خوشگوار تعلقات قائم رہے۔ ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں پوپ اور لوئی نہم شاہ فرانس کے متحدہ لشکر نے مینفریڈ پر چڑھائی کر دی اور اس کو شکست دے کر قتل کر دیا اس کے ساتھ ہی مصر اطالیہ کی دوستی ختم ہو گئی۔

صلیبیوں سے معرکہ آرائیاں
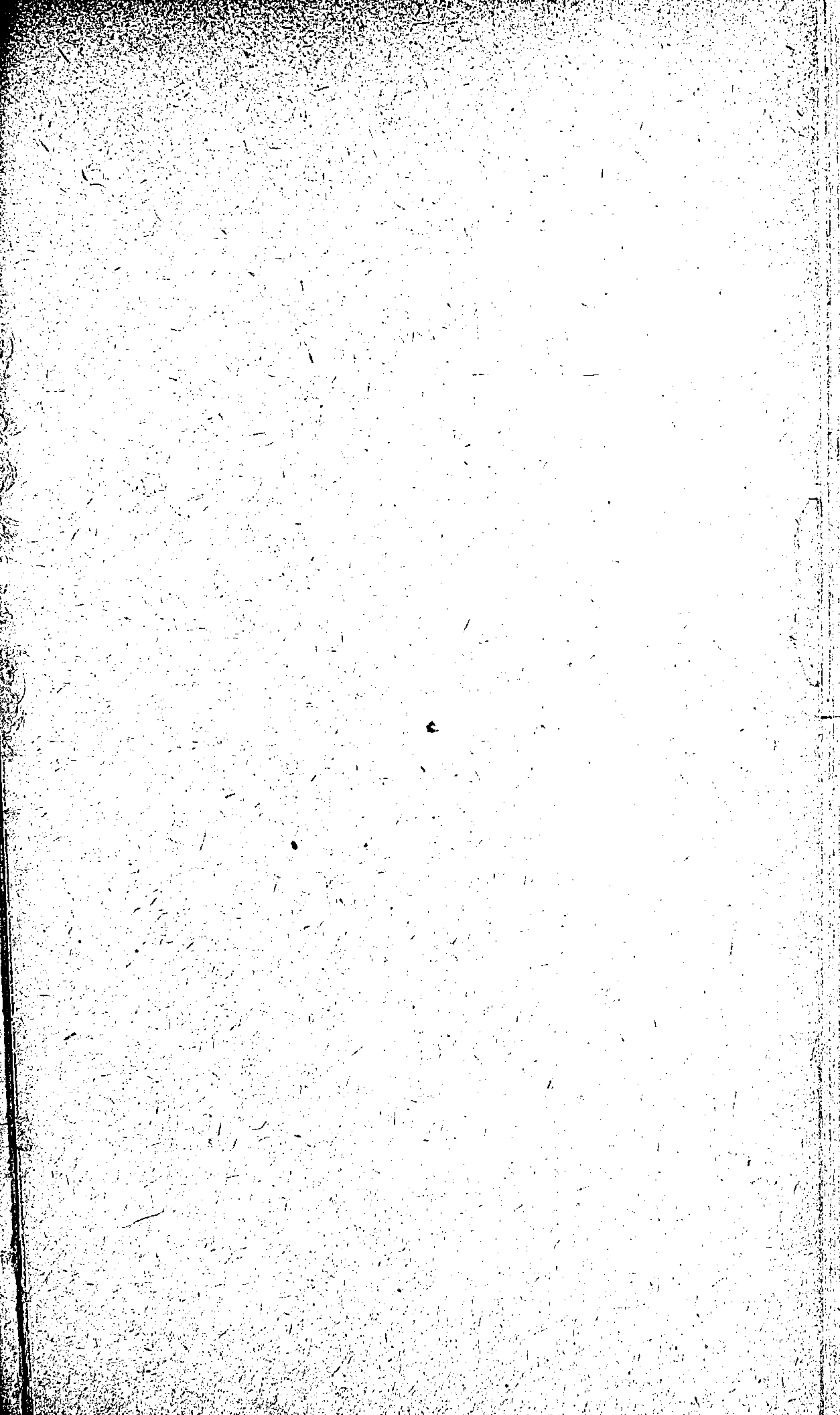
قلبِ اسلام میں صلیبی خنجر

الملک الظاہر بیبرس نے اپنی حکومت کے پہلے پانچ سالوں میں تاتاری غارتگروں کو شام سے نکالا اور ان کے خلاف ایک زبردست عسکری اور سیاسی محاذ قائم کیا۔ مصر اور شام کو متحد کیا۔ خلافتِ عباسیہ کا احیاء کیا۔ ایک دانشمندانہ خارجہ حکمتِ عملی وضع کی اور ملک کا اندرونی نظم و نسق درست کیا۔ ان کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ شام۔ فلسطین اور لبنان کے صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوا جو نہ صرف پورے ساحل پر ایک آہنی جنگی قلعہ بند دیوار بنائے ہوئے جمے تھے بلکہ کئی اندرونی مقامات پر بھی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ صلیبیوں کے اہم اور مستحکم ترین مقامات یہ تھے:

الکرک۔ قیساریہ۔ ارسوف۔ صفد۔ یافا۔ شقیف ارنون (بالفورٹ) القرین (مانٹفورٹ) انطاکیہ۔ حصن الاکراد۔ انطرطوس۔ المرکب (مرقب) صور۔ بیروت۔ طرابلس عکہ۔ صیدا۔

ان قلعوں میں سے اکثر کو مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے صلیبیوں سے چھین لیا تھا لیکن اس کی وفات کے بعد جو حالات رونما ہوئے ان کا فائدہ اٹھا کر صلیبی اُن پر پھر قابض ہو گئے تھے۔ سخت جنگجو یانہ ذہنیت رکھنے والے یہ صلیبی مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے انہوں نے اپنے مقبوضات اور ان کے نواحی علاقوں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ حد یہ کہ مسلم دشمنی کے جنون میں ان کی ایک کثیر تعداد ہلاکو خاں کے غارت گر لشکر میں جا شامل ہوئی تھی۔ انہوں نے مسلمان علاقوں کو تاخت و تاراج کرنے اور بے کس مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے میں تاتاری وحشیوں کے

ساتھ برابر کا حصہ لیا تھا۔ پھر وہ ہر وقت یورپ کے اسلام دشمن بادشاہوں اور پاپائے روم کو مصر و شام پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ اس طرح ارضِ فلسطین لبنان و شام میں اُن کی موجودگی ایک ایسے خنجر کی حیثیت رکھتی تھی، جو قلبِ اسلام میں پیوست ہو۔ قدرت نے ان لوگوں کو بہتیری ڈھیل دی تھی لیکن اب وقت آ گیا تھا کہ کوئی اور صلاح الدین اٹھے اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچا دے۔ یہ صلاح الدین ثانی (بقول عرب مورخین) یا نیا صلاح الدین (بقول مغربی مؤرخین) اللہ تعالیٰ نے الملک الظاہر بیبرس کی صورت میں بھیج دیا۔ اس نے صلیبی فتنہ پروروں پر پے در پے ایسی مہلک ضربیں لگائیں کہ صلاح الدین اعظم کی یاد تازہ ہو گئی۔ مشرقی اور مغربی تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ صلیبیوں کے خلاف سلطان بیبرس کا جہاد سلطان صلاح الدین کی ترکتازیوں سے لگا کھاتا ہے۔ مغربی مؤرخین نے اس کی داستانِ جہاد کو اختصار کے ساتھ قلمبند کیا ہے اور اس میں بھی خاصی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے جس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ بیبرس کو فاتح تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ظالم اور غارت گر ثابت کیا جائے۔ تاہم عرب مؤرخین کی مستند اور مفصل روایات سے مغربی مؤرخین کے دجل و تلبیس کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں صلیبیوں کے خلاف سلطان بیبرس کی معرکہ آرائیوں کا حال نہایت اختصار کے ساتھ درج کرتے ہیں:

خونِ اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

الکرک کی تسخیر

۶۶۳ھ کے وسط میں الملک الظاہر بیبرس نے صلیبیوں کے خلاف اپنی طوفانی یلغار کا آغاز کیا۔ وہ ایک جرّار لشکر کے ساتھ قاہرہ سے نکلا اور ارضِ فلسطین میں داخل

ہُوا۔ یہاں اس کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ صلیبیوں کو اُس کی نقل و حرکت کی اطلاع ملی تو وہ اپنے مضبوط ساحلی قلعوں میں زور شور سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ یکایک سلطان شمال سے جنوب مشرق کی طرف پلٹا اور برق رفتاری سے پیش قدمی کرتا ہُوا الکرک کے سامنے نمودار ہُوا۔ یہ ایک قدیم اور مستحکم قلعہ تھا اور اس پر نہایت کمینہ خصلت صلیبی قابض تھے۔ انہوں نے مسلم آزاری اور غارت گری کو اپنا پیشہ بنا رکھا تھا۔ مصر سے حجاز جانے والے حاجیوں کے قافلے ان کی خون آشامیوں کا خاص ہدف تھے۔ مصر سے حجاز کو جانے والا راستہ الکرک کے قریب سے گزرتا تھا جونہی حجاج کا کوئی قافلہ الکرک کے نواح میں پہنچا۔ الکرک کے شریر النفس صلیبی اس پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے، حاجیوں کو شہید کر ڈالتے اور ان کا مال اسباب لُوٹ لیتے۔ سلطان کے اچانک حملے نے ان ظالم بزدلوں کو حواس باختہ کر دیا اور معمولی مزاحمت کے بعد انہوں نے قلعہ خالی کر دیا۔ سلطان الکرک میں فاتحانہ داخل ہُوا تو اس کو اطلاع دی گئی کہ صلیبیوں نے وہاں کے قلعہ نما تاریخی گرجے ناصرہ کو اپنی جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ہُوا تھا۔ سلطان نے اس گرجے کو مسمار کرا دیا اور الکرک کی فصیل بھی زمین کے برابر کر دی۔ اس کے بعد وہ پھر کبھی صلیبیوں کا مرکز نہ بن سکا اور مصری حاجیوں کے قافلے صلیبیوں کے شر سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔ الکرک کی فتح کے بعد سلطان مصر واپس آ گیا اور دو سال تک دوسری سرگرمیوں میں مصروف رہا تاہم اس کی پُراسرار خاموشی کسی طوفان کی آمد کا پتا دیتی تھی۔

فتح قیساریہ

۱۲۶۵ء میں سلطان کی فوجوں نے پھر بڑی تیزی سے نقل و حرکت شروع کر دی اور پیشتر اس کے کہ بحیرۂ روم کے مشرقی ساحل کے قلعہ بند صلیبیوں کو سلطان

کے ارادوں کا علم ہوتا وہ ایک چکر کاٹ کر قیسار یہ[1] کو اپنے گھیرے میں لے چکا تھا یہ تاریخی شہر ایک اہم بندرگاہ اور صلیبیوں کا ایک مضبوط مرکز تھا سلطان کے اس حملے کے باوجود صلیبیوں نے جی نہ چھوڑا لیکن پرجوش مسلمانوں کی خوفناک ضربوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہ چلی اور سات دن کی خون ریز جنگ کے بعد انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان نے قلعے میں داخل ہو کر حکم دیا کہ اس کو مسمار کر دیا جائے چنانچہ قلعے کی بنیادیں تک کھود دی گئیں۔ قیساریہ کی فتح نے اس آہنی جنگی دیوار میں شگاف ڈال دیا جو صلیبیوں نے تمام ساحل کے ساتھ بے شمار جنگی قلعوں کی صورت میں تعمیر کر رکھی تھی۔ یہ قلعے تمام بندرگاہوں میں خشکی کی جانب بنائے گئے تھے۔ دفاعی لحاظ سے اس کا یہ فائدہ تھا کہ دشمن اگر خشکی کی طرف سے محاصرہ کرلے تو سمندر کا راستہ بہر صورت کھلا رہے۔ سمندر ہی کے ذریعے یورپ سے ان کا رابطہ قائم رہتا تھا اور وہاں سے تازہ دم جنگجوؤں۔ آلاتِ حرب اور اشیائے خوراک وغیرہ کی کمک پہنچتی رہتی تھی ان بندرگاہوں کے مدخلوں پر برج تعمیر کر دیئے گئے تھے اور فوجی چوکیوں یا قلعوں کا ایک زنجیرہ قائم کر دیا گیا تھا جس کے ذریعے سے تمام ساحلی قلعے اور بندرگاہیں ایک سلسلے میں منضبط ہو گئی تھیں۔ لبنان و فلسطین کے ساحل پر ایسے کئی برج آج بھی آثار قدیمہ کی صورت میں موجود ہیں۔ قیساریہ صلیبیوں کے جنگی زنجیرے کی سب سے پہلی کڑی تھی جس کو سلطان کی شمشیر خارا شگاف نے ایک ہی وار میں توڑ ڈالا۔ سلطان نے اس قلعہ پر حملے کا منصوبہ جس عمدگی سے تیار کیا، اس نے اس کی غیر معمولی ذہانت، ژرف نگاہی اور حسنِ تعمیری مہارت کا بیّن ثبوت مہیا کر دیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا

---

[1] مؤرخین نے اس کو قیصریہ اور قیصاریہ بھی لکھا ہے۔ قیساریہ آجکل ویران پڑا ہے لیکن ماضی بعید میں یہ بڑا بارونق شہر تھا۔

ہے کہ محاصرے کے دوران میں وہاں کے صلیبیوں کو کسی دوسری طرف سے مطلق کوئی مدد نہ پہنچ سکی اسی طرح قلعے کی تسخیر کے بعد سلطان نے اس کے دفاعی استحکامات کو اس انداز سے ملیامیٹ کیا کہ صلیبی طالع آزماؤں کو دوبارہ اس طرف کا رُخ کرنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔

ارسوف پر قبضہ

قیساریہ کو پامال کرنے کے بعد سلطان نے جنوب کا رُخ کیا اور آناً فاناً قلعہ ارسوف کا محاصرہ کرلیا۔ یہ ہاسپیٹلرز[1] صلیبیوں کا ایک مضبوط مرکز تھا۔ قیساریہ کا انجام دیکھ کر ان لوگوں نے زبردست دفاعی تیاریاں کر رکھی تھیں چنانچہ وہ چالیس دن تک محاصرین کا نہایت پامردی سے مقابلہ کرتے رہے لیکن آخر ہمت ہار بیٹھے اور سلطانی افواج ان کے دفاعی استحکامات کو روندتی ہوئی قلعے کے اندر داخل ہوگئیں اس قلعے کا بھی وہی حشر ہوا جو قیساریہ کا ہو چکا تھا۔ سلطان نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی اور اس کی مضبوط فصیلیں اور بلند و بالا برج خواب و خیال بن کر رہ گئے۔

صفد کی تسخیر

اس سے اگلے سال یعنی ۲۶۶ھ میں سلطان پھر قاہرہ سے نکلا اور ایک

---

[1] ہاسپیٹلرز (Hospitallers) صلیبی جنگ جوؤں کا ایک گروہ تھا۔ شروع میں ان کا مقصد یروشلم آنے والے عیسائی زائرین کی مہمان داری اور خدمت کرنا تھا لیکن بعد میں وہ ایک جنگ جو گروہ کی صورت اختیار کر گئے جس کو مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔

طوفانی یلغار کر کے صفد کے مشہور قلعے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ یہ قلعہ نہایت بلند اور مضبوط تھا اور عمیق خندقوں سے گھرا ہوا تھا۔ اس میں عام عیسائیوں کے علاوہ ہیکلی جنگجوؤں[1] کی ایک کثیر تعداد بھی موجود تھی۔ ان سب نے متحد ہو کر کئی دن تک سلطانی فوج کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر مسلمانوں کے تابڑ توڑ حملوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ سلطان نے قلعہ میں داخل ہو کر عام شہریوں کو تو امان دے دی لیکن دو ہزار کے قریب ہیکلی جنگجو اس کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ یہ لوگ صفد کے نواحی علاقے کے پُرامن اور بے گناہ مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچاتے رہتے تھے اور سلطان کے نزدیک ان کا یہ جرم کسی صورت میں معافی کے قابل نہیں تھا۔

فلپ کے حتی کا بیان ہے کہ صفد کی فصیل پر آج تک یہ کتبہ موجود ہے:

"سکندرِ زمان عماد الدین"

اسی سال سلطان نے دریائے اردن پر ایک عظیم الشان پل تعمیر کرایا اور اس پر بھی اپنا کتبہ نصب کرایا۔ یہ پل اب تک موجود ہے اور جسر الدامیۃ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پل اب خشکی پر قائم ہے کیونکہ بعد میں دریائے اردن اپنا رُخ بدل کر کئی میل دُور بہنے لگا۔

یافا پر قبضہ

صفد کی فتح کے بعد شیر اپنی کچھار میں واپس آ گیا اور دو سال تک سستاتا

---

[1] اس سے مراد ٹمپلرز (Templers) ہیں جو صلیبیوں کا ایک سفاک گروہ تھا۔ وہ یروشلم میں ہیکل سلیمانی کے قریب رہتے تھے اس لیے ٹمپلرز یا ہیکلی مشہور ہو گئے۔ شروع میں ان کا مقصد بھی خدمتِ خلق تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ ایک جنگجو فرقہ بن گئے اور مسلم دشمنی کو اپنا پیشہ بنا لیا۔

رہا۔ ۲۶۸ ہجری میں وہ پھر اپنی کچھار (قاہرہ) سے نکلا اور ایک ہی جست میں یافا پر جا پڑا[1]۔ یہ شہر بھی صلیبیوں کا ایک اہم مرکز تھا۔ انہوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا لیکن بارہ گھنٹے کی شدید جنگ کے بعد سلطان نے ان کو مغلوب کر لیا اور قلعہ کی فصیل پر اپنا پرچم لہرا دیا۔

قلعۃ الشّقیف کی تسخیر

یافا کی فتح کے بعد[2] سلطان شقیف عرنون (یا شقیف ارنون)[3] کے پہاڑی قلعے کی طرف متوجہ ہوا جو صور و صیدا کے ساحلی علاقے کو البقاع اور دمشق سے ملانے والے جنوبی درے کی چوکیداری کرتا تھا۔ یہ قلعہ ہیکلی جنگجوؤں (ٹمپلرز) کا ہیڈ کوارٹر تھا اور اپنے دفاعی استحکامات کی بنا پر بالکل ناقابلِ تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ یہ قلعہ ایک عمودی چٹان پر بنایا گیا تھا۔ دریائے لیطانی سے اس کی بلندی ڈیڑھ ہزار فٹ اور سطح بحر سے ۲۱۹۹ فٹ تھی۔ اس کا ایک حصہ پتھروں کی چٹائی سے اور دوسرا حصہ

---

[1] یافا کا موجودہ نام تل ابیب (Tel Aviv) ہے اور یہ صیہونی ریاست "اسرائیل" کا دارالحکومت ہے۔

[2] بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ یافا کو قلعۃ الشقیف کی تسخیر کے بعد فتح کیا گیا۔

[3] شقیف عرنون یا ارنون ایک قریبی گاؤں کا نام تھا، یہ قلعہ بھی اسی نام سے مشہور ہو گیا۔ صلیبی اس کو بشاطودی بیوفورٹ یا بیلفورٹ (Belfort) کہتے تھے۔ یہ قلعہ اب تک موجود ہے اور قلعۃ الشقیف کے نام سے مشہور ہے۔

پہاڑ کی چٹانیں تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کا مجموعی رقبہ چار ہزار دو سو نوّے مربع گز تھا۔ دیواروں کی لمبائی ایک سو تیس ۱۳۰ گز، چوڑائی تینتیس ۳۳ گز اور بلندی انیس ۱۹ گز سے چھبیس ۲۶ گز تک تھی۔ اس کے جنوب اور مغرب کی طرف ایک خندق تھی جو ٹھوس چٹان کاٹ کر بنائی گئی تھی یہ خندق سولہ ۱۶ گز سے اکتیس ۳۱ گز تک گہری تھی۔ اس خندق میں چٹان کاٹ کاٹ کر چھوٹے چھوٹے کمرے بنائے گئے تھے اور پانی کے چشمے نکالے گئے تھے۔ قلعے کی عمودی دیواریں گھاٹیوں کے کناروں سے اوپر اٹھائی گئی تھیں اور ان کے کونوں پر بلند اور مستحکم بُرج بنے ہوئے تھے جن میں بیٹھ کر نہ صرف دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا سکتی تھی بلکہ اس کو پسپا کرنے کے لیے وہاں سے تیروں اور پتھروں کی بارش بھی کی جا سکتی تھی عام حالات میں اس قلعے پر قبضہ کرنا تو کجا اس پر حملے کا تصور کرنا بھی دیوانے کا خواب معلوم ہوتا تھا۔ لیکن اپریل ۱۲۶۸ء میں جب سلطان بیبرس دشوار گزار طویل پہاڑی راستوں کو طے کرتا ہوا ایکا ایک "قلعۃ الشقیف" کے سامنے نمودار ہوا تو صلیبی سکتے میں آ گئے تاہم قلعے کے زبردست استحکامات نے ان کی ہمت بندھائے رکھی اور انہوں نے سلطانی افواج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ سلطان کو بھی اس قلعے کے استحکامات کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ وہ اپنے ساتھ بہت سی دیو پیکر منجنیقیں لایا تھا۔ اس نے حکم دیا کہ چھبیس ۲۶ منجنیقیں قلعہ کے سامنے مناسب مقامات پر نصب کر دی جائیں۔ یہ منجنیقیں آناً فاناً نصب ہو گئیں اور ان سے قلعہ پر دن رات بھاری پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے اہلِ قلعہ کو باہر سے کسی قسم کی مدد پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صلیبیوں کی قوتِ مدافعت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ پانچ ہفتے کے بعد بالکل جواب دے گئی۔ صلیبی ایک ایک کر کے کٹ مرے یا خفیہ راستوں سے ساحلی علاقوں کی طرف بھاگ گئے۔ میدان صاف ہوتے ہی سلطان اپنے لشکر کے ساتھ تکبیر و تہلیل کرتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہوا اور اس کے بلند ترین برج

پر اپنا عَلَم نصب کر دیا۔ قلعہ الشقیف کی فتح سے صلیبیوں پر بڑی کاری ضرب لگی اور ان میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔

انطاکیہ کی فتح المفتوح

گزشتہ چند سالوں میں پے بہ پے فتوحات نے مسلمانوں کے حوصلے دو چند کر دیئے تھے اور وہ اس خطۂ ارض کو ہمیشہ کے لیے صلیبیوں کے وجود سے پاک کر دینے پر تُل گئے تھے۔ سلطان کا دل بھی اپنی فوج کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا وہ اپنے لشکریوں کے جذبات کو خوب سمجھتا تھا اور جانتا تھا کہ ان سے کس موقع پر کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ یافا اور الشقیف کو فتح کرنے کے معاً بعد اس نے اپنے ذہن میں ایک عظیم منصوبہ تیار کیا اور پھر اپنی فوجوں کو جو جذبۂ جہاد سے سرشار تھیں طرابلس کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ ادھر چند دنوں سے صلیبیوں کے تمام ساحلی علاقے زور شور سے جنگی تیاریوں میں مشغول ہو گئے تھے کیونکہ کسی کو کچھ علم نہ تھا کہ سلطان اب کس کو اپنی یلغار کا نشانہ بناتا ہے اور پھر ایک دن جب اہلِ طرابلس نے دیکھا کہ سلطان کی فوجیں قلعہ کے سامنے حدِّ نظر تک پھیلی ہوئی ہیں تو وہ سمجھ گئے کہ اب ان کی باری ہے ــــ طرابلس صلیبیوں کا بڑا مضبوط قلعہ تھا اور انھوں نے یہاں بے پناہ جنگی قوت جمع کر رکھی تھی، وہ قلعہ بند ہو کر مسلمانوں سے ایک طویل جنگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے ــــ لیکن ایک دن وہ صبح اٹھے تو یہ دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ طرابلس کے ارد گرد دُور دُور تک مسلمانوں کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

اہلِ طرابلس کی حیرت بیجا نہیں تھی کیونکہ مسلمان راتوں رات ہی نہایت خاموشی سے طرابلس کا محاصرہ اٹھا کر شمال کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ ان کی منزلِ مقصود انطاکیہ کی لاطینی ریاست تھی جو اُبوالفدا کے الفاظ کے مطابق "نہایت ہی شریر النفس اور

بلکہ خصلت صلیبیوں سے معمور تھی" اور گزشتہ ایک سو ستر برس سے مسلمانوں کو دعوتِ مبارز[ت]
دے رہی تھی۔[۱] انطاکیہ کی ریاست کئی سو مربع میل پر محیط تھی اور خود انطاکیہ (Antioch)
کا بارونق شہر ایک نہایت مستحکم دوہری فصیل کے اندر ـــ دریائے المقلوب کے
کنارے صدیوں سے سر ابھارے کھڑا تھا اس میں عیسائیوں کے کئی مقدس مقامات ـ
عظیم الشان گرجے اور مضبوط قلعے تھے ـــ اس شہر کی حفاظت کے لیے دو لاکھ
سے اوپر صلیبی جنگ جو موجود تھے اور فوجی تربیت پائے ہوئے مقامی عیسائیوں
کی ایک کثیر تعداد بھی ان کی پشت پر تھی۔

سلطان کو بیسیوں میل دور ـــ دشوار گزار پہاڑوں سے پرے طرابلس الشام
کے محاصرے میں مصروف دیکھ کر اہلِ انطاکیہ بالکل مطمئن تھے ـــ ان کے وہم وگمان
میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ خطرہ ان کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ وہ سمجھ رہے تھے
کہ مسلمان ان کی زبردست قوت سے ٹکرانے کی جرأت کبھی نہیں کریں گے لیکن ایک
دن جب انہوں نے قلعے کی فصیلوں سے دیکھا کہ انطاکیہ کے چاروں طرف بے شمار

---

[۱] انطاکیہ ہر زمانے کا بڑا مشہور شہر تھا اور عیسائیوں کے نزدیک ایک مقدس مقام کا درجہ رکھتا تھا۔ مسلمانوں نے اسے سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں فتح کیا۔ چند سال بعد اس کو یونانیوں نے لے لیا مگر بہت جلد مسلمانوں کے قبضہ میں واپس آگیا۔ عرصۂ دراز کے بعد پہلی صلیبی جنگ کے دوران میں صلیبیوں نے اس پر پوری قوت سے حملہ کیا اور سات ماہ کے پرصعوبت محاصرے کے بعد اوائل جون ۱۰۹۸ء میں اس کو فتح کر لیا۔ یہ فتح ایک نومسلم ارمنی فیروز (بہروز) کی غداری کی مرہونِ منت تھی جو ایک خفیہ راستے کے ذریعے صلیبیوں کو قلعہ کے اندر لے گیا تھا۔ اسی وقت سے یہ شہر صلیبیوں کے قبضے میں تھا اور یہاں انہوں نے ایک ریاست قائم کر لی تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی مجاہدانہ ترکتازیاں بھی اس شہر کو مسخر کرنے میں بوجوہ کامیاب نہ ہوئی تھیں۔

جھنڈوں کا ایک سمندر لہریں مار رہا ہے تو حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات نے ان کو مغلوب کر لیا۔ یہ جھنڈے سلطان بیبرس کی فوج کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے تھے جوں جوں یہ جھنڈے انطاکیہ کے قریب آ رہے تھے نعرہ ہائے تکبیر سے انطاکیہ کی فضا میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا۔ مسلمانوں کا یہ حملہ اچانک بھی تھا اور نہایت دلیرانہ بھی۔ اس سے پہلے کہ صلیبی اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر سکتے، مسلمان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ انطاکیہ پر حملہ آور ہو چکے تھے اور پہلے ہلے میں ہی اس کی "ناقابلِ تسخیر" فصیل کے ایک حصے پر قبضہ کر چکے تھے۔ صلیبی نہ تعداد میں کم تھے اور نہ ان کے پاس آلاتِ حرب و ضرب کی کمی تھی۔ انہوں نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا اور مسلمانوں کے سامنے سدِّ سکندری بن کر کھڑے ہو گئے۔ اس گھمسان کا رَن پڑا کہ انطاکیہ کے گلی کوچوں میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور ہر طرف نعشوں کے انبار لگ گئے۔ مسلمان اپنے گھروں سے سینکڑوں میل دُور سر پر کفن باندھے لڑ رہے تھے ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر یہاں وہ شکست کھا گئے تو پھر ان کو نہ مصر میں پناہ مل سکتی ہے اور نہ شام میں۔ جب وہ سلطان کو اپنے پہلو بہ پہلو والہانہ انداز میں لڑتے دیکھتے تھے تو ان کی ہمتیں دوچند ہو جاتی تھیں چنانچہ صلیبی اپنا سارا زور لگانے کے باوجود مسلمانوں کو پیچھے دھکیلنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور باختلافِ روایت دو یا چھ دن کی خونریز جنگ کے بعد ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

اس طرح ارضِ مشرق میں دوسری قدیم ترین لاطینی ریاست ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ سلطان بیبرس نے صلیبیوں پر اب تک جو فتوحات حاصل کی تھیں یہ فتح ان میں سب سے بڑی تھی اور حقیقی معنوں میں فتح الفتوح کی حیثیت رکھتی تھی۔

ابوالفدا کا بیان ہے کہ انطاکیہ کی لڑائی میں صلیبی فوج کے سولہ[16] ہزار سپاہی مقتول ہوئے اور ایک لاکھ کے قریب جنگی قیدی بنا لیے گئے انہیں فروخت کیا گیا تو ایک

نوجوان لڑکے کی قیمت بارہ[۱۲] درہم اور ایک نوجوان لڑکی کی قیمت پانچ[۵] درہم پڑی ۔
مالِ غنیمت کی اس قدر افراط تھی کہ درہم و دینار پیمانے بھر بھر کر سپاہیوں میں تقسیم کیے گئے
عیسائی مؤرخین کہتے ہیں کہ سلطان نے شہر کے تمام پرانے گرجوں اور قلعوں کو نذرِ آتش
کر دیا۔ ان میں سے بعض کو عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ معلوم نہیں ان کے اس بیان میں کس
حد تک صداقت ہے کیونکہ انطاکیہ میں آج بھی بہت سے پرانے گرجے اور قلعے موجود ہیں
انطاکیہ پر سلطان کے حملے سے پہلے وہاں کا درندہ صفت صلیبی حکمران بوہمنڈ
(بوہیمان) طرابلس گیا ہوا تھا۔ انطاکیہ پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان نے اس کو خط لکھا کہ

"انطاکیہ میں تمہارے آدمیوں میں سے ایک بھی نہیں بچا جو تمہیں
اس شہر کے انجام سے مطلع کرتا اس لیے ہم خود یہ ناگوار فرض بجا لاتے
ہیں۔ جن استحکامات پر تم کو ناز تھا وہ سب ملیا میٹ ہو چکے ہیں چونکہ
ان کی بربادی پر تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنے والا بھی کوئی نہیں
اس لیے ہم ہی تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔"

سلطان کے خط کے ستم ظریفانہ مندرجات پر بوہمنڈ کا خون کھول اٹھا لیکن
یورپ کے عیسائی بادشاہوں اور پاپائے روم کے پاس اپنی داستانِ الم لکھ بھیجنے
کے سوا وہ کچھ نہ کر سکا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد وہ قبرص
چلا گیا ۔

ارمنوں کی سرکوبی

انطاکیہ کی فتح کے بعد سلطان نے اپنے پُرجوش لشکر کے ساتھ ارمینیہ[۱] (Armenia)

---

[۱] ارمینیہ ایشیائے قریب کا ایک ملک ہے جو دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان گھرا ہوا ہے

(باقی ص ۱۴۷ پر)

پر یلغار کر دی اس کا مقصد اس پہاڑی ملک پر قبضہ کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ارمنی عیسائیوں کو ان کی اسلام دشمنی کی سزا دینا چاہتا تھا۔ یہ لوگ ایل خانی منگولوں اور فلسطین و شام کے صلیبیوں کے حلیف تھے اور مسلمانوں کو ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے سلطان ارمینیہ کے وسیع علاقوں کو پامال کرتا ہوا اناطولیہ تک پہنچ گیا اور وہاں کے اہم شہر اذنہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ارمنی عیسائی کسی جگہ بھی جم کر سلطان کا مقابلہ نہ کر سکے[1] اسی اثنا میں اس کو خبر ملی کہ یورپ میں پھر "صلیبی جہاد" کا وعظ شروع ہو گیا ہے اور یورپ کے صلیبیوں کا ایک زبردست لشکر مصر و شام پر حملہ کے لیے پر تول رہا ہے سلطان یہ خبر سن کر اپنی مظفر و منصور فوجوں کے ساتھ مصر کی طرف پلٹا اور چند دن کے بعد قاہرہ پہنچ گیا۔ اہل مصر نے اپنی فاتح افواج کا بڑے جوش و خروش سے استقبال کیا اور شکرانے کی نمازیں ادا کیں۔

لوئی نہم کی صلیبی مہم

لوئی نہم شاہ فرانس بائیس سال پہلے ساتویں صلیبی جنگ میں مسلمانوں سے ذلت آمیز شکست کھا چکا تھا اور قید و بند کی مصیبتیں بھی کاٹ چکا تھا لیکن اس کا مذہبی جوش ابھی تک سرد نہیں ہوا تھا جب اس نے انطاکیہ کی عیسائی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنی تو

بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶: شمال کی طرف پونٹک اور جنوب کی سمت طارس کا سلسلہ کوہ ہے اس کا مجموعی رقبہ تین لاکھ مربع کیلو میٹر کے قریب ہے۔ آجکل اس کے کچھ علاقے ترکی میں شامل ہیں اور کچھ روس میں۔ سلطان بیبرس کے عہد میں اس کی سرحدیں شام اور انطاکیہ کی صلیبی ریاست سے ملتی تھیں۔

[1] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان نے ارمینیہ کے حکمران ہیثم کو شکست دے کر اس کے لڑکے کو گرفتار کر لیا اور بعد میں فدیہ کی ایک کثیر رقم لے کر اس کو رہا کیا۔

اس کا خون کھول اٹھا اور وہ ارضِ مقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے خواب ایک بار پھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں اس کو پوپ کلیمنٹ چہارم کا خط ملا جس میں اس کو ترغیب دی گئی تھی کہ وہ راہِ خدا میں کچھ کام کرے اور ارضِ مقدس کو مسلمانوں کے پنجے سے چھڑانے کی تیاری کرے ــــ بادشاہ، پوپ کا خط پڑھ کر صلیبی جنگ کے لیے ہمہ تن مستعد ہو گیا اور دن رات جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ ۱۲۷۰ء میں وہ صلیبی طالع آزماؤں کے ایک جرار لشکر کے ساتھ ارضِ مقدس کی طرف روانہ ہوا۔ ابھی وہ جہاز پر سوار ہوا ہی تھا کہ اس کے سربرآوردہ امیروں نے مشورہ دیا کہ پہلے شمالی افریقہ کے مسلمانوں کو زیر کر لیا جائے تو مصر اور شام کی مملوک حکومت کو شکست دینے میں آسانی رہے گی اور ارضِ مقدس پر بھی کسی دقّت کے بغیر قبضہ ہو سکے گا۔ لوئی نے ان کا مشورہ مان لیا اور اپنی فوج کے ساتھ تیونس (Tunis) کے ساحل پر اتر گیا۔ تیونس پر اس وقت بنو مرین کی حکومت تھی۔ اس ملک پر قبضہ کیے ہوئے انہیں ابھی صرف دو تین برس ہی گزرے تھے اس لیے وہ ساحل کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہ کر سکے تھے تاہم وہ ملک کے اندر صلیبیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئے۔

اُدھر سلطان بیبرس، قاہرہ میں بیٹھ کر صورتِ حالات پر کڑی نظر رکھ رہا تھا اور یورپی حملہ آوروں سے نبٹنے کے لیے زبردست فوجی تیاریاں کر رہا تھا۔ لوئی نہم اس کے لیے کوئی نئی شخصیت نہیں تھی اس کے دست و بازو وہ سالہا سال پہلے منصورہ کے معرکے میں آزما چکا تھا لیکن اس موقع پر قدرت نے ایک عجیب صورت میں مسلمانوں کی مدد کی۔ صلیبیوں کو ساحلِ تیونس پر اترے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ان میں طاعون کی وبا پھیل گئی اور ان کا وہی حشر ہوا جو مکہ معظمہ پر حملہ کے وقت ابرہہ کے لشکر کا ہوا تھا ــــ ہزاروں صلیبی اپنے "مقدس بادشاہ" سمیت طاعون میں مبتلا ہو کر مر گئے جو باقی بچے ان میں بھگدڑ مچ گئی اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ نکلا۔ اس طرح آٹھویں

صلیبی جنگ میں صلیبیوں کو عبرت ناک ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔[۱]

قبرص پر چڑھائی

اسی زمانے میں سلطان کو اطلاع ملی کہ فلسطین، شام اور لبنان سے بھاگے ہوئے صلیبیوں نے جزیرہ قبرص (Cyprus) کو اپنا مستقر بنا لیا ہے اور وہاں وہ مملوک سلطنت کے خلاف زور شور سے جنگی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ سلطان نے ان کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک جنگی بیڑا قبرص کی طرف روانہ کیا لیکن شومیٔ قسمت سے یہ بیڑا منزلِ مقصود کے قریب پہنچ کر ایک خوفناک سمندری طوفان میں پھنس گیا ملاحوں نے اس کو بچانے کے لیے بڑا زور مارا لیکن قضا کے سامنے کچھ پیش نہ چلی اور یہ بیڑا بالکل تباہ ہو گیا۔ یہ سانحہ سلطان کے لیے سخت صبر آزما تھا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور حکم دیا کہ فوراً ایک نئے بیڑے کی تیاری شروع کر دی جائے چنانچہ تھوڑے سے ہی عرصہ میں ایک نیا بیڑا تیار ہو گیا جو برباد شدہ بیڑے سے زیادہ بڑا اور مضبوط تھا اس بیڑے کے تیار ہوتے ہوتے حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار

---

[۱] بعض مشرقی مؤرخین نے آٹھویں صلیبی جنگ کے بارے میں عجیب و غریب روایتیں بیان کی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ سلطان بیبرس اپنے چند معتمد ساتھیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر تیونس پہنچا اور وہاں تیونسی فوجوں کو صلیبیوں کے خلاف لڑنے کی تربیت دی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ والئ تیونس نے خود بربنائے مصلحت صلیبیوں کو تیونس آنے کی دعوت دی۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ تیونسی فوجوں نے صلیبیوں پر خوفناک حملے شروع کر دیئے اور ان کو سخت نقصان پہنچایا۔ ان روایات کی صحت کے بارے میں تو مختلف رائیں ہو سکتی ہیں لیکن ایک بات جس پر سبھی مؤرخین متفق ہیں یہ ہے کہ صلیبیوں کی بربادی کا اصل سبب طاعون کی وبا ہوئی۔

کی کہ اس سے کام لینے کی نوبت ہی نہ آئی تاہم اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن کو سمندر کے راستے سلطان کی مملکت پر حملہ کرنے کی کبھی جراُت نہ ہوئی۔

شہزادہ ایڈورڈ کی صلیبی مُہم

لوئی نہم کی موت کے بعد، انطاکیہ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے انگلستان کے ایک شہزادے کو جوش آ گیا۔ یہ شہزادہ شاہ ہنری سوم کا فرزند ایڈورڈ تھا جو بعد میں ایڈورڈ اول کے نام سے انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ نوابانِ واروک (Warwick) اور پمبروک (Pembrok) نے شہزادے کا ساتھ دیا اور وہ اسی سال ۱۲۷۰ء میں ارضِ مقدس کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں کچھ عرصہ صقلیہ میں قیام کیا اور پھر عکّہ پہنچ گیا۔ لیکن جنونی شہزادے کو اس ساری زحمت سے اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا کہ پہلے تو وہ شدید بخار میں مبتلا ہو گیا اور جب کئی ہفتوں کے بعد اس سے نجات ملی تو ایک دن ایک مسلمان قاصد[1] کسی اہم شخصیت کا خط لے کر اس کے پاس پہنچا۔ شہزادے نے جونہی خط پڑھنا شروع کیا قاصد نے بغل سے ایک چھری نکالی اور اس کو گھونپ دی۔ شہزادہ شدید زخمی ہوا لیکن کئی ماہ زیرِ علاج رہنے کے بعد اس کی جان بچ گئی۔ اب شہزادے کا دل ٹوٹ چکا تھا اور ادھر اس کا باپ بھی اس کو انگلستان واپس آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ چنانچہ چودہ ماہ فلسطین میں قیام کرنے کے بعد وہ ناکام و نامراد اپنے وطن کو لوٹ گیا۔ اس کے فلسطین کے زمانۂ قیام میں

---

[1] بہت سے مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ قاصد باطنی فدائی تھا۔ معلوم نہیں کہ شہزادے پر قاتلانہ حملہ سے باطنی کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے ورنہ عام حالات میں تو وہ صلیبیوں سے حلیفانہ تعلقات رکھتے تھے۔

انگلستان کے صلیبیوں کو مسلمانوں کے مقبوضات پر دست درازی کی ہمت نہ پڑی سلطان بیبرس نے بھی ان کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی۔ بہرصورت ان کا ناکام و نامراد واپس جانا ایک نیک فال تھا۔

حصن الاکراد کی فتح

مصر، شام اور فلسطین سے کسی بڑی صلیبی جنگ کا خطرہ دور ہوتے ہی سلطان نے اوائل ۱۲۷۱ء میں صلیبیوں کے خلاف اپنی مہم پھر شروع کی۔ وہ قاہرہ سے ایک زبردست فوج کے ساتھ نکلا جس کے جوش و خروش کی یہ کیفیت تھی کہ

ع دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس کے لشکر کی نقل و حرکت اتنی تیز تھی کہ صلیبیوں کے لیے اس کے عزائم کو بھانپنا سخت محال تھا۔ وہ ابھی سلطان کے ہدف کے بارے میں قیاس آرائیاں ہی کر رہے تھے کہ ۲۴ مارچ ۱۲۷۱ء کو سلطان حصن[1] الاکراد کے سامنے نمودار ہوا اور آناً فاناً اس کا محاصرہ کر لیا۔ ایک گول بنجر پہاڑی کی چوٹی پر بنا ہوا یہ زبردست اور مستحکم قلعہ قرون وسطیٰ کے قلعوں میں سب سے محفوظ ترین تھا۔ یہ اس شمالی وتّے کا پاسبان تھا جو طرابلس و طرطوس اور حمص و حماۃ کے میدانوں کے درمیان تھا۔ اس قلعے میں بیک وقت دو ہزار فوج ٹھہر سکتی تھی اور یہ طرابلس الشام کے کاؤنٹ کی ملکیت تھا۔ سلطان کے حملے کے وقت اس کی حفاظت پر ہیکلی جنگجو (ٹمپلرز) مامور تھے۔ انہوں نے پندرہ دن تک مسلمانوں کا سخت مقابلہ کیا اور پھر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ سلطان نے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی مرمت کرائی اور اس کی

---

[1] (Crac Des Chivaliers)

فصیل پر اپنی فتح کا کتبہ نصب کرایا۔

القرین کی تسخیر

حصن الاکراد پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کے بعد سلطان پھر طرابلس الشام کی طرف بڑھا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ چند دن کے بعد اس نے یکایک محاصرہ اٹھایا اور بیروت صیدا اور صور کو ایک طرف چھوڑتا ہوا القرین (مانٹفورٹ)[۱] پر حملہ کر دیا۔ قلعہ میں مقیم صلیبیوں کے لیے یہ حملہ بالکل خلافِ توقع تھا۔ تاہم انھوں نے کچھ دیر ہاتھ پاؤں مارے اور عکّہ کے صلیبیوں کو اپنی مدد کے لیے بلا بھیجا لیکن اس سے پہلے کہ ان کو کسی طرف سے مدد پہنچتی سلطان قلعہ کے بیرونی استحکامات کو پامال کرتا ہوا قلعے کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اس نے قلعے پر قبضہ کر کے اس کو منہدم کرنے کا حکم دیا اور اس وقت وہاں سے ٹلا جب اس مضبوط قلعے کی بنیادیں تک کھد چکی تھیں۔

صلیبیوں سے معاہدۂ امن

سلطان کی پے در پے فتوحات نے صلیبیوں کو دہشت زدہ کر دیا اور انھوں نے اپنے کئی چھوٹے چھوٹے قلعوں سے خود بخود دستبرداری اختیار کر لی البتہ کچھ مضبوط قلعے ابھی تک ان کے قبضے میں تھے۔ ان کے نام یہ تھے:

۱۔ المرکب[۲]
۲۔ انطرطوس[۳]

} یہ دونوں قلعے ساحلی سڑک اور بندرگاہوں کی حفاظت کرتے تھے تاکہ مصری بیڑا حملہ آور ہو تو اس کے مقابلے کے لیے تیار رہیں۔

---

[۱] (Montfort)

(۲-۳ کا حاشیہ ص ۱۵۳ پر)

۳- عکہ

۴- طرابلس الشام

۵- بیروت

۶- صور

۷- صیدا

سلطان کی فاتحانہ یلغار سے ان سب قلعوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ ان کے صلیبی حکمران اب سر جوڑ کر بیٹھے اور کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ سلطان سے صلح کی درخواست کی جائے چنانچہ سلطان ابھی اپنا آئندہ لائحہ عمل طے ہی کر رہا تھا کہ صلیبیوں کی طرف سے قاصد پہ قاصد آنے لگے جن کے ذریعے اس کو نہایت لجاجت آمیز پیرائے میں صلح کا پیغام دیا گیا تھا۔ سلطان بڑا وسیع الظرف انسان تھا، صلیبیوں کی منت سماجت پر اس کا دل پسیج گیا، اور اس نے کچھ شرائط پہ صلیبیوں سے صلح کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی ان میں دو اہم شرطیں یہ تھیں:

۱- صلیبی اپنے قلعوں کے موجودہ استحکامات میں اضافہ نہیں کریں گے۔

۲- وہ ان قلعوں اور شہروں میں مقیم مسلمانوں سے رواداری کا برتاؤ کریں گے اور نواحی علاقوں کے مسلمانوں سے بھی چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے۔

صلیبیوں نے سلطان کی سب شرطیں بلا تامل قبول کر لیں اور اس کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۵۲) بعض مؤرخین نے اس کو "المرقب" یا مرقب" لکھا ہے اس کے معنی ہیں دیدبانی یا پہرے کا برج۔ ساحل پر واقع یہ قلعہ ہاسپیٹلرز (ضیاف الغرباء) کا مرکز تھا۔ یہ قلعہ آج تک پہاڑ پر ایک بڑے جنگی جہاز کی صورت میں موجود ہے۔

۳؎ یہ قلعہ ہیکلی جنگجوؤں (ٹمپلرز) کا مرکز تھا۔ آج کل اس کو طرطوس کہتے ہیں اس کے قدیم قلعے کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

دس سال دس مہینے اور دس دن کے امن کا معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ ۱۲۷۲ء میں لکھا گیا اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں کی طرف سے اس پر انگلستان کے بادشاہ ایڈورڈ پلانٹیجنٹ۔ یروشلم کے سابق بادشاہ ہف سوئم اور انطاکیہ کے سابق بادشاہ بوہمنڈ (بوہیمان) نے دستخط کیے اور اس کی موت کے بعد اس کے جانشین نے اس معاہدہ کی تصدیق کی۔

باطنیوں کا استیصال

مؤرخین نے الملک الظاہر بیبرس کے جن سنہری کارناموں کا تخصیص کے ساتھ ذکر کیا ہے ان میں "باطنیوں کا استیصال" بھی شامل ہے۔

باطنیہ (حشاشہ۔ حشیشین یا حشاشین) کی خفیہ تحریک کی بنیاد حسن بن صباح نے ۴۸۳ھ ۱۰۹۰ء میں رکھی تھی۔ وہ دنیوی لحاظ سے ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا لیکن اپنی غیر معمولی ذہانت اور بلند ہمتی کی بدولت بڑا عروج حاصل کیا۔ اس نے پہلے قلعہ الموت پر قبضہ کیا جو ماژندران میں نہایت پیچیدہ گھاٹیوں کے اندر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور کسی دشمن کے لیے خون کے دریا میں تیرے بغیر اس پر قبضہ کرنا محال تھا۔ حسن بن صباح نے اسی قلعہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ سلطان ملک شاہ سلجوقی کے آخری دور میں حسن کی قیادت میں باطنیوں نے بڑا زور پکڑا۔ انہوں نے طبس۔ قاین۔ تون۔ خالنجان گردکوہ۔ غور۔ خوسف۔ اردہن۔ قلعۃ الناظر۔ قلعۃ الطنبور اور بیسیوں دوسرے قلعوں پر قبضہ کر کے زبردست فوجی قوت جمع کر لی اور ایک علیحدہ مملکت قائم کر لی جو دولت اسمٰعیلیہ مشرقیہ یا دولت ملاحدہ قہستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے حکمرانوں کا لقب شیخ الجبل یا شیخ الجبال تھا۔

باطنیوں کے کئی درجے تھے داعی الدعاۃ۔ داعی اکبیر۔ داعی۔ رفیق اور فدائی وغیرہ

فدائی وہ گروہ تھا جو آنکھیں بند کر کے بلا عذر و حجت شیخ الجبل کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض عین سمجھتا تھا کہا جاتا ہے کہ حسن بن صباح نے دشوار گذار پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک پُرفضا گھاٹی میں ایک مصنوعی جنت بنائی تھی۔

مؤرخین نے اس مصنوعی جنت کا ایسا دلکش نقشہ کھینچا ہے کہ نگاہوں کے سامنے اصلی جنت کے نظارے گھوم جاتے ہیں۔ حسن اپنے کچھ مُریدوں کو بھنگ (حشیش) پلا کر مدہوش کر دیتا تھا اور پھر ان کو اسی مدہوشی کی حالت میں اپنی مصنوعی جنت میں پہنچا دیتا تھا۔ چند دن کے بعد وہ ان کو اسی طرح مدہوش کر کے اپنی جنت سے باہر نکال دیتا تھا۔ یہی لوگ فدائی بن جاتے تھے وہ ایک دفعہ "جنت" کا جلوہ دیکھ کر ہمیشہ اسی کی آرزو میں مست رہتے تھے اور شیخ الجبل کے حکم پر پہاڑ سے کود کر یا کسی دوسرے طریقے سے جان دینے کو ہنسی کھیل سمجھتے تھے۔ باطنیوں نے چند سال کے اندر اندر اتنی زبردست قوت پیدا کر لی کہ سلطان محمد سلجوقی اور سلطان سنجر سلجوقی اپنا پورا زور لگانے کے باوجود ان کا قلع قمع نہ کر سکے۔

حسن بن صبّاح اور اس کے جانشین جس شخص کو اپنا مخالف پاتے اسے کسی فدائی کے ہاتھوں قتل کروا ڈالتے۔ فدائیوں کا آلۂ قتل بالعموم زہر میں بجھی ہوئی تیز دھار کی چھُری یا خنجر ہوتا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے بے شمار دینی پیشواؤں، حکمرانوں اور سیاسی رہنماؤں کو قتل کیا ان میں سے چند نامور شخصیتوں کے نام یہ ہیں:

خواجہ نظام الملک طوسی۔ ابومسلم حاکم رے۔ اتابک مودود والئ دیار بکر۔ ابوجعفر شاطبی رازی۔ قاضی عبداللہ اصفہانی۔ قاضی ابوالعلا صاعد بن ابومحمد نیشاپوری۔ وزیر فخر الملک ابوالمظفر بن نظام الملک طوسی۔ قسیم الدولہ آقسنقر۔ قاضی ابوسعید ہروی۔ معین الملک ابونصر احمد بن فضل وزیر سلطان سنجر۔ الامر باحکام اللہ ابوعلی بن مستعلی صاحب مصر۔ آقسنقر حاکم مراغہ۔ خلیفہ المسترشد باللہ عباسی۔ داؤد بن سلطان سنجر سلجوقی۔ علین الدولہ خوارزم شاہ۔

عبداللطیف خجندی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب "سلاجقہ" میں "راحۃ الصدور" کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"باطنی فدائیوں نے اکابر وقت کے علاوہ عام مسلمانوں کو بھی بکثرت دھوکے سے قتل کیا صرف اصفہان میں جو سازش سلطان محمد کے زمانہ میں پکڑی گئی اس میں پانچ سو کے قریب مسلمانوں کی لاشیں ایک مکان سے نکلی تھیں۔"

ان بدبختوں نے مسلمانوں کی پشت پناہ مجاہدِ کبیر سلطان صلاح الدین ایوبی پر بھی قاتلانہ حملہ کرنے سے دریغ نہ کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ سلطان اپنی خوبیٔ قسمت سے بچ گیا ورنہ باطنیوں نے اپنی طرف سے اس کی زندگی کا چراغ گل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ غرض یہ دہشت پسند گروہ تقریباً ایک سو ستر سال تک عالمِ اسلام کے جسد کا ناسور رہا۔ خدا کی قدرت کہ ان کی مرکزی قوت کا خاتمہ بھی ایک دوسرے دشمنِ اسلام گروہ کے ہاتھوں ہوا۔ یہ تھے ایل خانی مغل۔ ۶۵۴ھ ۱۲۵۶ء میں ہلاکو خاں سیلِ بلا کی طرح قلعہ الموت کی طرف بڑھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس وقت باطنیوں کا حکمران رکن الدین خور شاہ بن علاء الدین (شیخ الجبل ہفتم) تھا۔ ہلاکو نے باطنیوں کے تقریباً سو[1] دوسرے قلعے بھی برباد کر دیے اور بارہ ہزار سے زیادہ باطنیوں کو قتل کیا۔ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اس موقع پر یہ تاریخی قطعہ لکھا:

سالِ عرب چو شش صد و پنجاہ و چار بود — یک شنبہ روز۔ اول ذیقعدہ بامداد
خورشاہ بادشاہ سماعیلیاں ز تخت — برخاست پیش تخت ہلاکو بایستاد

---

[1] باطنی فی الحقیقت فرقہ اسمٰعیلیہ ہی کی ایک شاخ تھے لیکن اپنے عجیب و غریب عقائد کے باعث یہ اپنے اصل فرقہ سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔

ہلاکو نے اگرچہ باطنیوں پر بڑی کاری ضرب لگائی تھی لیکن وہ اُن کا کلیتہً خاتمہ نہ کر سکا۔ اس کا سبب یہ تھا۔ کہ باطنیوں کے کچھ قلعے شام کے علاقے میں واقع تھے چونکہ سلطان بیبرس نے تاتاریوں کو شکست دے کر شام سے نکال دیا تھا اس لیے یہ قلعے ان کی دستبرد سے بچ گئے۔ شام میں حشیشیوں کی اہم پناہ گاہوں کے نام یہ تھے :۔

بانیاس۔ مصیاف (مصیاد یا مصیات) کہف اور خوابی۔

یہ قلعے پہاڑی علاقوں میں نہایت محفوظ مقامات پر بنائے گئے تھے اور ان کے دفاع کے لیے ہزاروں حشیشی جنگجو ہر وقت کمربستہ رہتے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی مرکزی قوت کی بربادی سے کوئی سبق حاصل نہ کیا بلکہ ایک دوسرے اسلام دشمن گروہ سے ساز باز کر لی۔ شام و لبنان میں انھوں نے ہیکلی صلیبیوں (ٹمپلرز) کو اپنا حلیف بنا لیا جو سلطان بیبرس اور عام مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے۔ اسی طرح انھوں نے یورپ کے عیسائی بادشاہوں سے بھی دوستی کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی۔ سلطان بیبرس کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنا اور اطراف و اکناف کے مسلمانوں کو اپنی دہشت گردیوں کا نشانہ بنانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ سلطان نے کئی سال تک ان کی شر انگیزیوں کو برداشت کیا لیکن آخر اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ صلیبیوں سے مؤثر طور پر نپٹ کر اس نے ۱۲۷۳ء میں باطنیوں کی طرف توجہ کی اور ایک طوفانی یلغار میں ان کے تمام قلعوں کو فتح کر کے ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ جن لوگوں نے اس کا مقابلہ کیا وہ نہایت ذلت کے ساتھ مارے گئے البتہ جو امان کے طالب ہوئے سلطان نے اُن کو امان دے کر مصر کے مختلف شہروں میں آباد کر دیا اور وہاں ان کو خاص نگرانی میں رکھ کر پُرامن زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا۔ اس طرح ایک سو بیاسی سال کے بعد اس دہشت پسند گروہ کا ہمیشہ کے

لیے مکمل طور پہ استیصال ہو گیا ۔

آخری تین سال

فتح نوبہ[1]

۶۷۴ھ/۱۲۷۵ء میں نوبہ (سوڈان) کے عیسائی بادشاہ ڈیوڈ (داؤد) نے سلطان
سے سرکشی اختیار کی اور اس کی سرحدی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ سلطان کو یہ خبر
ملنے کی دیر تھی کہ وہ طوفان کی طرح نوبہ کی طرف بڑھا[2] اور ڈیوڈ کی مملکت کے وسیع
علاقوں کو پامال کرتا ہوا دنقلہ (ڈونگولا) کے اہم شہر تک پہنچ گیا۔ ڈیوڈ کہیں بھی قدم
جما کر نہ لڑ سکا اور بالآخر ذلت انگیز شکست کھا کر مسلمانوں کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔
جب اس کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ گڑگڑا کر عفو کا خواستگار ہوا۔ سلطان
نے اس سے تاوانِ جنگ اور سالانہ خراج ادا کرنے کا وعدہ لے کر اس کی جان بخش دی۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ تاریخ الخلفاء میں امام ذہبیؒ کے حوالے سے لکھتے
ہیں کہ:-

"سب سے پہلے ۲۳ھ ہجری میں عبداللہ بن ابو سرح نے پانچ
ہزار کی جمعیت سے نوبہ پر چڑھائی کی تھی لیکن فتح نہ کر سکے اور صلح کر
کے واپس آ گئے پھر ہشام کے زمانے میں فوج کشی ہوئی مگر ناکامی
ہوئی۔ منصور بھی لڑا مگر وہی نتیجہ ہوا۔ تکین زنگی۔ کافور اخشیدی۔
ناصر الدولہ ابن حمدان، توران شاہ برادر صلاح الدین نے یکے بعد دیگرے

---

[1] (Nubia)

[2] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ نوبہ کی تسخیر کے لیے سلطان نے اپنے ایک امیر
آقسنقر کو بھیجا۔

اس ملک پر حملہ کیا مگر کسی کی پیش نہ گئی آخر اس وقت (یعنی سلطان بیبرس کے عہد میں) اس کی گھڑی آ لگی۔ ابن عبدالظاہر نے ایک قصیدہ اس فتح پر لکھا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے:۔

ترجمہ: "یہ ایسی فتح ہے کہ کبھی نہیں سنی گئی
نہ آنکھوں نے دیکھی نہ لوگوں نے بیان کیا"

معرکۂ ابلستین

نوبہ کی فتح کے بعد سلطان کو پھر تاتاریوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ عام حالات میں شاید وہ اُن کی طرف دھیان نہ دیتا لیکن کچھ عرصہ سے تاتاریوں نے ایسا مُفسدانہ رویّہ اختیار کر رکھا تھا کہ سلطان کے لیے خاموش بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ ہلاکو خاں کی وفات کے بعد ایل خانیوں کی سیادت اس کے بیٹے اباقا خاں نے سنبھالی تھی۔ وہ اگرچہ اپنے باپ سے بھی زیادہ عیسائیت نواز اور اسلام دشمن تھا اور ارمنوں اور فلسطین و شام کے صلیبیوں سے گہرے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا لیکن اپنے حلیفوں کو وہ سلطان بیبرس کی ہولناک یلغار سے نہ بچا سکا تھا۔ اس کے راستے میں اپنے ہی بھائی بند چٹان بن کر کھڑے ہو گئے تھے یہ تھے خوانین اردوئے زرّیں جو سلطان کے پکّے حلیف اور مددگار تھے۔ انھوں نے اپنے تابڑ توڑ حملوں سے اباقا خاں کو مصر و شام پر چڑھائی کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اس کے چند دستوں نے ایک دفعہ شام پر یورش کرنے کی کوشش کی لیکن سلطان کے سپہ سالار امیر قلاؤن نے ان کو شکست پر شکست دے کر وہاں سے نکال دیا۔ اس دوران میں اباقا خاں نے یورپ کے عیسائی بادشاہوں سے برابر نامہ و پیام جاری رکھا اور ان کو بیبرس کے خلاف لشکر کشی پر آمادہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ اس کے ایک ایسے ہی خط

کے جواب میں ایڈورڈ اوّل شاہِ انگلستان نے اس کو ۲۶ جنوری ۱۲۷۵ء کو جو خط لکھا وہ ایل خانیوں اور یورپ کے عیسائی حکمرانوں کے باہمی تعلقات پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔ یہ خط اب تک محفوظ ہے اس کا مضمون یہ تھا:

"پادری ڈیوڈ ہمارے دربار میں پہنچا اور اس نے ہمیں وہ خطوط دکھائے جو آپ نے مقدس باپ پاپائے اعظم اور یورپ کے دوسرے فرماں رواؤں کو بھیجے ہیں ان خطوں میں آپ نے دینِ مسیحی کے ساتھ جس محبت کا اظہار کیا ہے ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہم آپ کے مبارک عزم کو بھی سراہتے ہیں جو آپ ارضِ مقدس کو دینِ مسیحی کے دشمنوں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے رکھتے ہیں۔ ہم جناب سے استدعا کرتے ہیں کہ اس مبارک ارادے کو ضرور عملی جامہ پہنائیں۔ اپنے بارے میں ہم فی الحال تیقّن کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کب ارضِ مقدس میں پہنچ سکیں گے ــــ کیونکہ ابھی تک اسقفِ اعظم کسی فیصلے پر نہیں پہنچے"

(ایڈورڈ اول شاہِ انگلستان)

۶۷۵ھ (۱۲۷۷ء) میں اباقا خاں کو "اردوئے زریں" کے حملوں سے قدرے مہلت ملی تو اس نے ایک جرّار لشکر کے ساتھ فلسطین شام اور ارمینیہ کی سرحدوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر نقل و حرکت شروع کر دی۔ سلطان کو یہ خبر ملنے کی دیر تھی کہ وہ نہایت تیز رفتاری سے خود ایل خانیوں کے استقبال کے لیے چل پڑا۔ سینکڑوں میل کا پُرصعوبت سفر کرنے کے بعد وہ ایشیائے کوچک میں داخل ہوا اور تاتاریوں کے بالمقابل ابلستین کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ یہ مقام فلسطین و شام کی سرحد کے قریب واقع تھا اور اس سے متصل بئر الذاب کا وسیع میدان تھا۔ اسی میدان میں سلطان اور اباقا خاں کی فوجوں میں ہولناک ٹکر ہوئی ــــ مسلمان فوج کا زیادہ حصہ مملوکوں پر مشتمل

تھا جن کو نہایت اعلیٰ فوجی تربیت دی گئی تھی۔ سلطان کی شاندار قیادت میں انہوں نے نہایت اعلیٰ جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور ایل خانی غارت گروں کو ایسی عبرت ناک شکست دی کہ معرکۂ عین جالوت کی یاد تازہ ہوگئی۔ ایل خانی اپنے آدمیوں کی چھ ہزار سات سو ستر (۶۷۷۰) لاشیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کا بہت کم جانی نقصان ہوا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس خونریز جنگ میں فریقین کے قریباً ایک لاکھ آدمی مارے گئے۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے مؤرخین کے بیان کے مطابق دونوں لشکروں کی مجموعی تعداد چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی اس لیے مقتولوں کی تعداد ایک لاکھ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہرصورت اس جنگ نے ایل خانیوں پر سلطان بیبرس کی طاقت کا رعب بٹھا دیا اور وہ سمجھ گئے کہ مصر و شام پر حملہ کرنا بہت مہنگا سودا ہے۔ ابلستین کی فتح کے بعد سلطان مظفر و منصور قاہرہ واپس پہنچا تو لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا اور اس کی صحت و درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں۔

سفرِ آخرت

ہر آنکہ زاد بناچار بایدش نوشید
ز جامِ دہر مے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

۶۷۶ھ کے اوائل میں سلطان دمشق میں مقیم تھا کہ سخت بخار میں مبتلا ہوگیا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کو ابلُستین کی جنگ میں ایک شدید زخم آیا تھا اسی زخم کے اثر سے وہ بیمار ہوگیا۔ طبیبوں نے جو علاج بھی ہو سکتا تھا کیا لیکن سلطان کا آخری وقت آچکا تھا کوئی علاج کارگر ثابت نہ ہوا اور ۲۷ محرم ۶۷۶ھ کو تاریخِ اسلام کے اس بطلِ جلیل نے ستاون برس کی عمر میں

داعئ اجل کو لبیک کہا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

سلطان کی وفات پر تمام عالمِ اسلام میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور اس کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگی گئیں اس کے برعکس صلیبیوں اور ایل خانیوں نے اپنے اس سب سے بڑے حریف کی موت پر بے پناہ مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔

دمشق کو ایک بار پھر یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے اپنے دور کے سب سے بڑے مجاہدِ اسلام کے جسدِ خاکی کو اپنی خاک کے اندر جذب کر لیا۔ اس سے پہلے یہ شہر الملک العادل سلطان نور الدین محمود زنگیؒ اور مجاہدِ کبیر سلطان صلاح الدین یوسف ایوبیؒ کا مدفن بننے کی سعادت حاصل کر چکا تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ تاریخِ اسلام کی ان تینوں عظیم شخصیتوں نے صلیبیوں کے خلاف معرکہ آرائیوں میں نام پیدا کیا تینوں نے دمشق میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور تینوں دمشق میں ہی آسودۂ خاک ہوئیں۔

دمشق میں سلطان بیبرس کا مقبرہ اس کے لقب "الملک الظاہر" کی نسبت سے "الظاہریہ" کہلاتا ہے وہاں آجکل ایک عظیم الشان کتب خانہ ہے۔ پروفیسر فلپ کے حتی کا بیان ہے کہ اس کتب خانے میں دنیا کا ایک قدیم ترین مخطوطہ موجود ہے جو کاغذ پر لکھا گیا یعنی "مسائلِ امام احمد بن حنبلؒ" اور اس پر ۲۲۶ھ (۸۷۹-۸۸۰ء) کی تاریخ ثبت ہے[1]۔

---

[1] پاکستان کے ایک چوٹی کے عالم علامہ عبدالعزیز میمنی کا بیان ہے کہ یہ مخطوطہ ۲۶۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اسے امام احمد بن حنبلؒ کے شاگرد امام ابوداؤد سجستانی نے قلمبند کیا ہے اور یہ چھپ بھی چکا ہے (اردو نامہ کراچی شمارہ ۳۲ - جولائی تا ستمبر ۶۸)۔

چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل

چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل
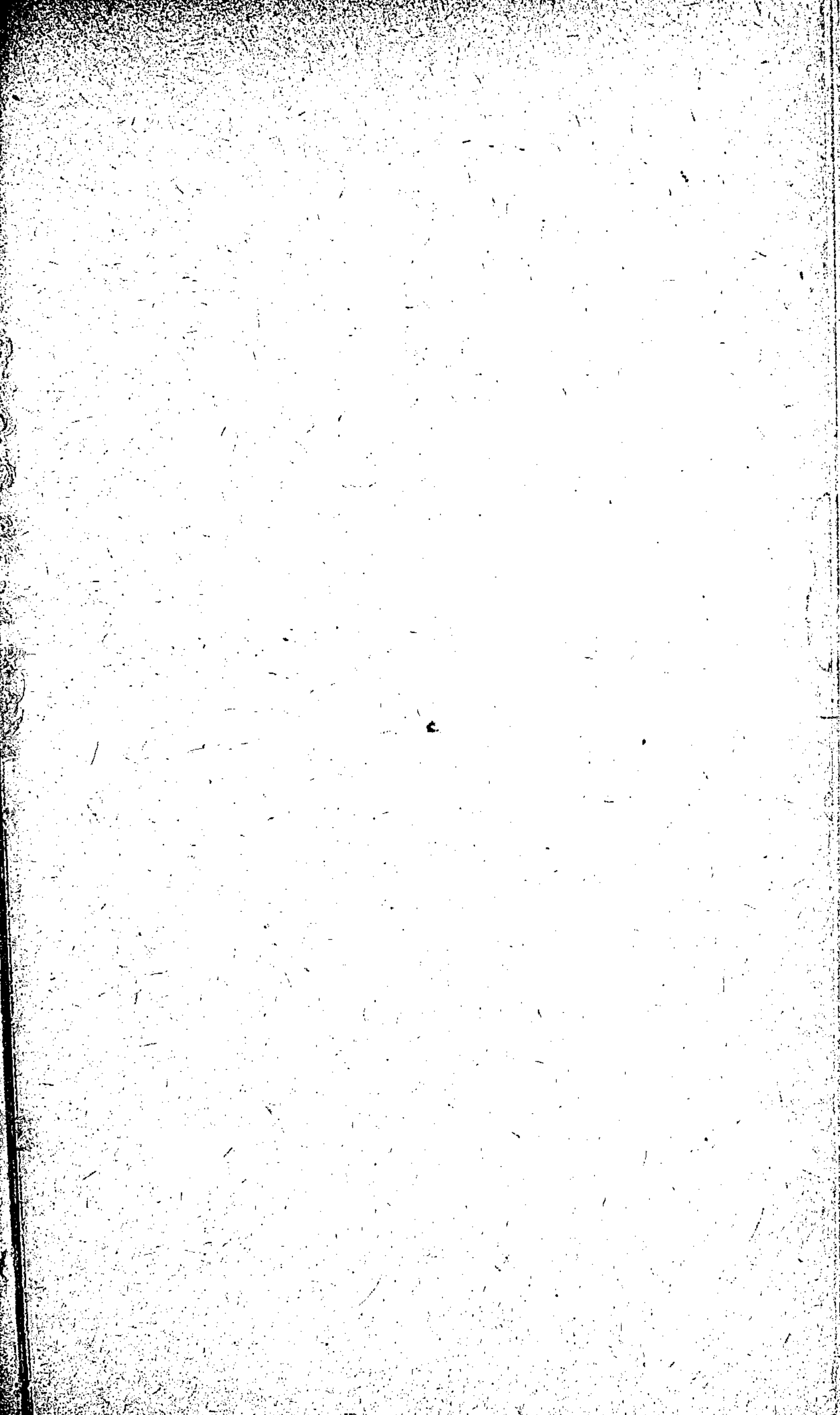
الملک الظاہر بیبرس کی وفات پر صلیبیوں اور ایل خانی مغلوں نے غیر معمولی مسرت اور طمانیت کا اظہار کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ سلطان کے اُٹھ جانے سے اُن کے راستے کا سب سے بڑا روڑا دور ہو گیا ہے اور اب وہ نہ صرف اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیں گے بلکہ مصر اور شام کو بھی آسانی سے روند ڈالیں گے لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی ـــــ سلطان کے دو قابل جانشینوں الملک المنصور قلاوون اور الملک الاشرف صلاح الدین خلیل نے اپنے عظیم پیشرو کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھا لیا اور چند سال کے اندر اندر انہوں نے ایک طرف ایل خانیوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملا دیا اور دوسری طرف ارضِ مشرق میں صلیبیوں کی قوت پر کاری ضربیں لگا کر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ سلطان بیبرس کے اُن نامور جانشینوں کے سوانح حیات بیان کرنا ہماری کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کی رحلت کے بعد ۱۲۹۱ء تک پیش آنے والے تمام اہم واقعات کو اختصار کے ساتھ یہاں بیان کر دیا جائے ان سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ سلطان بیبرس نے اپنی مجاہدانہ ترکتازیوں سے جس کام کی نیو ڈالی تھی وہ پایۂ تکمیل تک کیسے پہنچا۔

الملک السعید برکہ خاں

سلطان بیبرس کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا ناصر الدین برکہ خاں اٹھارہ

سال کی عمر میں تختِ حکومت پر بیٹھا اور "الملک السعید" کا لقب اختیار کیا[1]۔ اس کے وزیر بلبائی نے سلطنت کا انتظام نہایت خوش اسلوبی سے چلایا لیکن وہ بہت جلد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد امیر آقسنقر وزیرِ سلطنت مقرر ہوا لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد ملک سعید نے کسی بات پر ناخوش ہو کر اس کو مروا ڈالا۔ اس پر مملوک امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ۶۷۸ھ میں اس کو معزول کر کے قلعۂ کرک میں محبوس کر دیا۔ وہاں اس نے اُسی سال وفات پائی۔

الملک العادل بدرالدین سلامش

ملک سعید کی معزولی کے بعد مملوک امراء نے اس کے چھوٹے بھائی بدرالدین سلامش کو الملک العادل کا لقب دے کر تخت پر بٹھایا۔ اس وقت سلامش کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ چنانچہ کاروبارِ سلطنت چلانے کے لیے امیر سیف الدین قلاوون کو اس کا اتابک اور مدار المہام مقرر کیا گیا۔ یہ انتظام باختلافِ روایت صرف تین ماہ یا چھ ماہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد امیر قلاوون نے مملوک امراء کی تائید و اعانت سے الملک العادل کو تخت سے اتار کر کرک بھیج دیا اور خود مسندِ حکومت پر بیٹھ گیا۔

الملک المنصور سیف الدین قلاوون

سلطان بیبرس کی طرح امیر قلاوون کا مولد بھی دشتِ قپچاق ہی تھا۔ اس کو

---

[1] علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ سلطان بیبرس نے اپنی زندگی میں ہی الملک السعید کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا۔ اس واقعہ کا ذکر وہ "تاریخ الخلفاء" میں اس طرح کرتے ہیں:

"۶۶۳ھ میں سلطان نے اپنے چہار سالہ بیٹے ملک السعید کو ولی عہد بنایا اور مع جلوس کے قلعہ سے اس کو سوار کر کے نکالا اور اس کا غاشیہ سلطان خود اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر لے گیا۔ تمام اُمراء جلوس کے ہمراہ پیدل تھے۔"

امیر آقسنقر نے الملک الصالح نجم الدین ایوب کے لیے ایک ہزار دینار پر خریدا تھا اس لیے وہ الفی کے عُرف سے مشہور تھا۔ ملک صالح نے اس کی قابلیت دیکھ کر ۶۴۷ھ میں آزاد کر دیا۔ اسی وقت سے اُس نے ترقی کی منازل طے کرنی شروع کر دیں۔ سلطان بیبرس کا دَورِ حکومت آیا تو اس نے امیر قلاوُون کو مملوک افواج کا سپہ سالار بنا دیا۔ جب اس نے تاتاریوں کے خلاف جنگوں میں غیر معمولی شجاعت کا مظاہرہ کیا تو سلطان اس قدر خوش ہُوا کہ اپنے بیٹے ناصر الدین برکہ خاں (الملک السعید) کو اس کا داماد بنا دیا اس طرح وہ سلطان بیبرس کا سمدھی اور نہایت قابلِ اعتماد ساتھی بن گیا۔ سلطان کی وفات کے بعد جب اس کے دونوں بیٹے یکے بعد دیگرے معزول کیے گئے تو تختِ حکومت پر بٹھانے کے لیے مملوک امراء کی نظر انتخاب امیر قلاوُون پر ہی پڑی چنانچہ رجب ۶۷۸ھ میں وہ "الملک المنصور" کا لقب اختیار کر کے مصر و شام کا فرماں روا بن گیا۔ سلطان قلاوُون بڑا شجاع۔ عاقل۔ مطبوع اور کم سخن آدمی تھا اس نے اپنے حُسنِ انتظام اور عظیم الشان فتوحات سے اپنے آپ کو صحیح معنوں میں "الملک المنصور" کے لقب کا مستحق ثابت کر دیا۔

شرف الدین سنجر کی بغاوت

سلطان قلاوُون نے تختِ نشین ہو کر سب سے پہلے امیر شرف الدین سنجر والئ دمشق کی طرف توجہ کی جس نے "الملک السعید" کے زمانے میں خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا اور "الملک العادل" کا لقب اختیار کر کے شام کا فرماں روا بن بیٹھا تھا۔ سلطان نے اس کی سرکوبی کے لیے اپنے سپہ سالار امیر طرنطائی کو بھیجا — شرف الدین سنجر نے سخت مقابلہ کیا لیکن بالآخر شکست کھا کر گرفتار ہو گیا اور سلطان کے حکم سے قاہرہ کے ایک تاریک زندان میں مقید کر دیا گیا۔ اس کی جگہ سلطان نے

اپنے ایک وفادار ساتھی امیر حسام الدین لاچین کو دمشق کا حاکم مقرر کیا۔

تاتاریوں کا حملہ

ادھر ایل خانی مغل عرصہ سے مصر و شام پر نظریں جمائے بیٹھے تھے مسلمانوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر اُن کی باسی کڑاہی میں پھر اُبال آیا اور ۶۸۰ھ/1281ء میں ان کے ایک زبردست لشکر نے شام پر چڑھائی کر دی۔ ایل خانیوں کی قیادت ہلاکو خاں کا بیٹا اباقا خاں کر رہا تھا اس کے لشکر میں اسّی ہزار سے زیادہ تو سوار تھے اور پیدل فوج کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ ارضِ شام پر ایل خانیوں کا اتنا زبردست لشکر اس سے پہلے کبھی حملہ آور نہیں ہوا تھا مملوک حکومت اپنے سارے جتنوں کے باوجود اس قدر لشکر فراہم نہیں ہوسکتی تھی لیکن سلطان قلاوون بڑے دل گردے کا انسان تھا وہ مطلق ہراساں نہ ہوا اور تھوڑی بہت جتنی فوج فراہم ہوسکتی تھی ساتھ لے کر برق رفتاری سے تاتاریوں کے مقابلے کے لیے بڑھا۔ ۱۴ رجب ۶۸۰ھ/1281ء کو حمص کے نواح میں حضرت خالدؓ بن ولید کے مزار کے متصل دونوں لشکروں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اس زور کا رن پڑا کہ ارض و سما کانپ اٹھے مسلمان سر سے کفن باندھ کر لڑ رہے تھے کیونکہ اُن پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ اگر اس جنگ میں تاتاری فتحیاب ہو گئے تو مصر و شام کے مسلمانوں کا حشر بغداد کے مسلمانوں سے مختلف نہیں ہوگا۔ کئی گھنٹوں کی ہولناک لڑائی کے بعد مغلوں میں ہزیمت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ مسلمانوں نے [illegible] لیا اور اس زور کا حملہ کیا کہ مغلوں کو اپنی ہزاروں لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر [illegible] مسلمانوں نے دُور دُور تک ان کا تعاقب کیا، اگر دریائے فرات اُن کے راستے میں حائل نہ ہو جاتا تو شاید وہ ایل خانیوں کے دار الحکومت مراغہ تک جا پہنچتے۔ اس عظیم الشان

فتح سے سلطان قلاؤون کو عالم اسلام میں وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو بیبرس کو عین جالوت کی فتح کے بعد حاصل ہوئی تھی۔ ایلخانی حکمران اباقا خاں اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد فوت ہو گیا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کے بھائی تکودار اوغلان (یا اوغلو) نے اس کو زہر دے کر مار ڈالا۔

ایلخانی سفارت

اباقا خاں کی موت کے بعد تکودار اوغلان اس کا جانشین ہوا۔ سر تھامس آرنلڈ نے "اشاعت اسلام"[1] میں ایک عیسائی مصنف کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> "تکودار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی۔ بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا — لیکن تکودار جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثرِ صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا اسلام اختیار کیا اور سلطان محمد یا احمد اپنا نام رکھا اور جس قدر ہو سکا اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں اور اس کے لیے انعام و اکرام اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی یہاں تک کہ اس کے زمانے میں بہت سے تاتاری مسلمان ہو گئے۔"

سلطان احمد نے ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء میں تخت نشین ہو کر سلطان قلاؤون سے دوستانہ مراسم قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے ایک دوستانہ سفارت مرتب کی اور اس کو علامہ قطب[2] الدین شیرازی اور اتابک بہاؤالدین کی سرکردگی میں

---

[1] (The Preaching of Islam) (ص ۱۷۴ پر)

بہت سے تحائف اور ایک طویل خط دے کر سلطان قلاؤون کی خدمت میں روانہ کیا۔ سلطان نے اس سفارت کی پیشوائی کے لیئے پندرہ سو (۱۵۰۰) مملوکوں کو سرحدِ شام پر بھیجا۔ یہ مملوک، لباس ہائے فاخرہ میں ملبوس تھے ان کے سروں پر طلائی پگڑیاں اور کمروں میں طلائی پٹکے تھے۔ سلطان نے بنظرِ احتیاط ان کو حکم دیا کہ ایلخانی سفارت کو رات کے وقت سفر کرا کر قاہرہ لائیں چنانچہ وہ اس سفارت کو اپنی جلو میں لے کر رات کے وقت سفر کرتے ہوئے بڑی شان و شوکت سے قاہرہ لائے۔ سلطان نے سفارت کے اراکین کو شاندار محلوں میں ٹھہرایا اور اُن کی خوب خاطر مدارات کی۔ جب اُن کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو سلطان نے ان کے سامنے ایلخانی حکمران سے دوستانہ تعلقات قائم ہونے پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور سلطان احمد

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۳)

[۲] علامہ محمود بن مسعود بن مصلح المعروف بہ قطب الدین شیرازی ۶۳۴ھ/۱۲۳۶ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ وہ فلسفہ، ہیئت اور طب کے نامور عالم تھے اور ایلخانی حکومت کے عمائد میں شمار ہوتے تھے۔ علم ہیئت میں ان کا استاد خواجہ نصیر الدین طوسی تھا۔ طب کی تعلیم انہوں نے پہلے اپنے باپ اور پھر اس دور کے دوسرے سربرآوردہ حکماء سے حاصل کی۔ تحصیلِ علم کے بعد کئی سال سیر و سیاحت میں مشغول رہے پھر ایلخانی حکومت میں سیواس کے قاضی مقرر ہوئے اور اس وقت کی سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا۔ آخیر عمر میں تبریز میں اقامت اختیار کر لی اور وہیں ۷۱۰ھ/۱۳۱۱ء میں وفات پائی۔ انہوں نے کئی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:-

نہایۃ الادراک فی درایۃ الافلاک۔ التحفۃ الشاہیہ۔ شرح حکمۃ الاشراق۔ التحفۃ السعدیہ۔ حاشیہ کشاف۔ مفتاح المنّان فی تفسیر القرآن۔ شرح مختصر الاصول لابن حاجب۔ درۃ التاج لغرۃ الدباج (انموزج العلوم)۔ حاشیہ حکمۃ العین۔ ان کتابوں میں تحفۃ السعدیہ نے بڑی شہرت حاصل کی یہ کلیات ابن سینا کی شرح ہے اور پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔

کے لیے کئی بیش بہا تحائف دیئے۔ اس طرح ایلخانی اور مملوک سلطنت میں وقتی طور پر دوستی قائم ہو گئی۔

بیمارستان الکبیر المنصوری کا قیام

اُسی سال (۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء میں) سلطان قلاؤون نے قاہرہ میں ایک عظیم الشان ہسپتال کی بنیاد رکھی جو بیمارستان الکبیر المنصوری کے نام سے مشہور ہوا۔ چند سال پہلے سلطان سخت بیمار ہو گیا تھا اور اس کو دمشق کے بیمارستان الکبیر النوری میں داخل ہونا پڑا تھا۔ اثنائے مرض میں اس نے منت مانی تھی کہ اگر وہ شفایاب ہو گیا تو قاہرہ میں ایک عدیم المثال ہسپتال قائم کرے گا۔ چنانچہ شفایاب ہو کر اس نے اپنا عہد پورا کیا اور لاکھوں دینار کے صرف سے "بیمارستان الکبیر منصوری" قائم کیا۔ انگلستان کے مشہور مستشرق ایڈورڈ جی براؤن نے اس ہسپتال کے بارے میں لکھا ہے کہ

> "بیمارستان الکبیر منصوری کے اخراجات پورے کرنے کے لیے تقریباً دس لاکھ درہم سالانہ کے اوقاف مقرر تھے اور یہ ہسپتال تمام مریض انسانوں، امیروں، غریبوں، عورتوں اور مردوں کے لیے بلا تخصیص عام تھا اور اس میں عورتوں کے لیے بھی ایسے ہی علیحدہ کمرے (وارڈز (Wards) بنائے گئے تھے جیسے مردوں کے لیے اور بیمار عورتوں کی تیمارداری کے لیے ویسے ہی تربیت یافتہ عورتیں (نرسیں) مقرر کی گئی تھیں جیسے مردوں کے لیے تربیت یافتہ تیماردار اور خدام مقرر تھے ـــــ اس ہسپتال میں ایک بڑا وارڈ مختلف قسم کے بخاروں کے مریضوں کے لیے مخصوص تھا۔ ایک وارڈ صرف امراضِ چشم میں مبتلا لوگوں کے لیے تھا ایک وارڈ جراحی سے تعلق رکھنے والے مریضوں

(سرجیکل کیسز) کے لیے تھا اور ایک وارڈ پیچش اور اس نوع کے دوسرے امراض کے مریضوں کے لیے مخصوص تھا ۔۔۔ اس کے علاوہ اس ہسپتال میں باورچی خانے ۔ درس و تقریر کے کمرے (لیکچر رومز) طبّی آلات اور دواؤں کی ذخیرہ گاہیں (سٹور رومز) اور اطبّا اور دوسرے عملہ کے رہنے کے مکانات بھی تھے ۔ ان کے علاوہ ایک دواخانہ[1] بھی تھا ۔"[2]

بیمارستان الکبیر المنصوری کا قیام سلطان قلاؤون کا ایک عظیم الشان کارنامہ شمار کیا جاتا ہے ۔ اس ہسپتال کے علاوہ سلطان نے ملک میں اور بھی کئی شفاخانے قائم کیے ۔ مدرسے بنوائے اور مسجدیں تعمیر کرائیں ۔ اس کی تعمیر کردہ مساجد میں ۔۔۔ "جامع منصوری" نے بڑی شہرت پائی ۔

صلیبیوں کے خلاف جہاد

۶۸۴ھ / ۱۲۸۵ء میں سلطان صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوا جو کچھ عرصہ سے پھر شرارتوں میں مشغول ہو گئے تھے ۔ تین سال پہلے طرطوس کے صلیبیوں نے سلطان قلاؤون کے ساتھ اس معاہدۂ امن کی تجدید کر لی تھی جو ان کے اور سلطان بیبرس کے درمیان قرار پایا تھا ۔ کچھ عرصہ بعد صور اور بیروت کے صلیبیوں نے بھی طرطوس کی تقلید میں مصالحت کی تجدید کر لی الیتہ المرکب (مرقب یا مرقاب) طرابلس الشام،

---

[1] (Dispensary)

[2] "طب العرب" مرتبہ علامہ حکیم علی احمد نیّر واسطی ۔۔۔ یہ کتاب ایڈورڈ جی براؤن کے لیکچروں کا اردو ترجمہ ہے ۔

بیدا، اور عکہ کے صلیبیوں نے صلحنامہ کی تجدید کی ضرورت محسوس نہ کی اور اپنی فوجی قوت کو تیزی سے بڑھانا شروع کر دیا۔ سلطان ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ رہا تھا اس نے اُن کو زیادہ ڈھیل نہ دی اور اپریل ۱۲۸۵ء کے وسط میں قلعہ المرکب کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ کے استحکامات کو توڑنے کے لیے چھوٹی اور بڑی کئی منجنیقیں استعمال کی گئیں اڑتیس دن کے شدید محاصرے کے بعد قلعہ فتح ہو گیا۔ سلطان نے ہیکلی جنگجوؤں (ٹمپلرز) سے جو اس قلعے کے محافظ تھے نہایت فیاضانہ برتاؤ کیا۔ اس نے ان کو اجازت دے دی کہ منقولہ جائیداد میں سے جتنی خود اٹھا سکیں ساتھ لے کر طرابلس چلے جائیں البتہ ان کو ہتھیار ساتھ لے جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ مؤرخ ابوالفداء کا بیان ہے کہ جس فوج نے المرکب کو تسخیر کیا اس میں وہ بھی شریک تھا اس وقت اس کی عمر صرف بارہ برس کی تھی اور اسے پہلی مرتبہ جنگ کا تجربہ المرکب ہی میں ہوا۔

فتح طرابلس الشام

۶۸۸ھ / ۱۲۸۹ء میں سلطان نے طرابلس الشام پر چڑھائی کی۔ اس شہر پر صلیبیوں نے ۱۸۵ سال پہلے قبضہ کیا تھا اور اردگرد کے علاقوں کو ضم کر کے اس کو ایک صلیبی ریاست کی شکل دے دی تھی۔ سلطان قلاوون کے زمانے میں یہ شہر صلیبیوں کے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا تھا اور مفتوحہ علاقوں کے اکثر صلیبی اسی شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ سلطان نے شہر کا نہایت سختی سے محاصرہ کر لیا اور اس کے استحکامات کو توڑنے کے لیے پندرہ سو سفر مینا اور انیس بڑی منجنیقوں سے کام لیا۔ ایک ماہ کی شدید سنگ باری اور تابڑ توڑ حملوں کے بعد سلطان نے شہر کو فتح کر لیا۔ ہزاروں صلیبی موت کے گھاٹ اتر گئے اور شہر کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مورخ ابوالفداء جو اس موقع پر بھی مسلمان لشکر میں موجود تھا لکھتا ہے کہ

"ہر طرف صلیبیوں کی لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے اور ان سے ایسی مکروہ بدبو اٹھ رہی تھی کہ میرے لیے وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔"

طرابلس کے بعد سلطان نے ایک اور قلعہ "البترون" کو بھی کسی خاص مزاحمت کے بغیر فتح کر لیا۔

وفات

طرابلس الشام کی فتح سے ایک سال پہلے سلطان کا ایک فرزند "علی" عین عالمِ شباب میں فوت ہو گیا تھا۔ وہ بڑا ہونہار اور بہادر نوجوان تھا۔ سلطان کو اس کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا اور اس کی صحت روز بروز گرنے لگی چنانچہ فتح طرابلس کے چند دن بعد ہی اس نے ۶ ذی قعدہ ۶۸۹ھ/۱۲۹۰ء کو قاہرہ میں وفات پائی۔

الملک الاشرف صلاح الدین خلیل

الملک المنصور قلاوون کی وفات کے بعد اس کا دوسرا فرزند صلاح الدین خلیل تخت پر بیٹھا اور "الملک الاشرف" کا لقب اختیار کیا۔ اس نے عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی صلیبیوں کے خلاف جہادِ عام کی تیاری شروع کر دی۔

طرابلس کے بعد صلیبیوں کا سب سے بڑا مرکز "عکہ" (Acre) تھا۔ اس شہر کو جنگی اعتبار سے زبردست اہمیت حاصل تھی اور دوسرے صلیبی قلعوں کی بقاء کا انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ الملک الاشرف نے سب سے پہلے اسی شہر پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔

فتح عکّہ

۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں سلطان نے ایک جرّار لشکر کے ساتھ عکّہ کا محاصرہ کر لیا اور بانوے منجنیقیں دن رات قلعہ پر پتھر برسانے کے لیے نصب کر دیں۔ بھیکلی جنگ جوؤں نے زبردست مزاحمت کی لیکن سلطانی فوج کا دباؤ اتنا شدید تھا کہ اُن کی کچھ پیش نہ چلی اور ایک ماہ کے بعد وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ سلطان نے شہر میں داخل ہو کر ان شریر النفس صلیبیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور شہر کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔

ارضِ مقدس سے صلیبیوں کا انخلاء

عکہ پر مسلمانوں کا قبضہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس نے دوسرے صلیبی قلعوں کی تسخیر کا راستہ ہموار کر دیا کیونکہ ان کے محافظ سخت دہشت زدہ ہو گئے اور اُن کی قوتِ مزاحمت بالکل جواب دے گئی۔ چنانچہ جس دن عکّہ فتح ہوا صُور کو اس کے صلیبی محافظوں نے اسی دن خالی کر دیا۔ تقریباً دو ماہ بعد مسلمانوں نے صیدا پر قبضہ کر لیا اس کے سات دن بعد بیروت۔ بیس دن کے بعد انطرطوس اور ایک ماہ کے بعد عثلیت کے صلیبیوں نے ہتھیار ڈال دیے اس طرح ۳ اگست ۱۲۹۱ء کو سلطان بیبرس کے چھوڑے ہوئے کام کی تکمیل ہو گئی اور یورپ کے صلیبیوں نے جو جہاد ۱۰۹۹ء میں مجنونانہ جوش و خروش کے ساتھ شروع کی تھی وہ پورے ایک سو ترانوے (۱۹۳) سال کے بعد ہمیشہ کے لیے خاکِ نامرادی میں سُلادی گئی[1]۔ شام کے ساحل سے کچھ دُور جزیرہ ارواد پر صلیبیوں کا ایک قلعہ باقی رہ گیا تھا گیارہ سال کے بعد مسلمانوں نے اسے بھی مسخّر کر لیا[2] اور فلپ کے حتی کے الفاظ میں "یُوں مسیحیت اور اسلام کے درمیان

---

[1] الملک الاشرف کو دو سال بعد مملوک امراء نے قتل کر دیا اس کے بعد ارباقی ص ۱۸۰ پر)

کش مکش کی سرگزشت کے ایک نہایت شاندار ڈرامے کا آخری پردہ گر گیا۔ یہی عماد الدین زنگیؒ، نورالدین محمودؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور رکن الدین بیبرس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) الناصر ناصر الدین محمود۔ العادل زین الدین کتبغا اور المنصور حسین الدین لاچین یکے بعد دیگرے تخت حکومت پر بیٹھے لیکن ان میں سے کوئی بھی دو سال سے زیادہ حکومت نہ کر پایا یہاں تک کہ ۶۹۸ھ میں الملک الناصر ناصر الدین محمد دوبارہ برسر اقتدار آگیا۔
[۲] ارواد کو الملک الناصر ناصر الدین محمد نے ۷۰۲ھ میں فتح کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جزیرہ کے صلیبیوں نے بحری قزاقی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ ارواد کی مہم میں مصر کے بحری بیڑے نے خاص حصہ لیا۔

سلطان بیبرسؒ کے ذاتی اوصاف
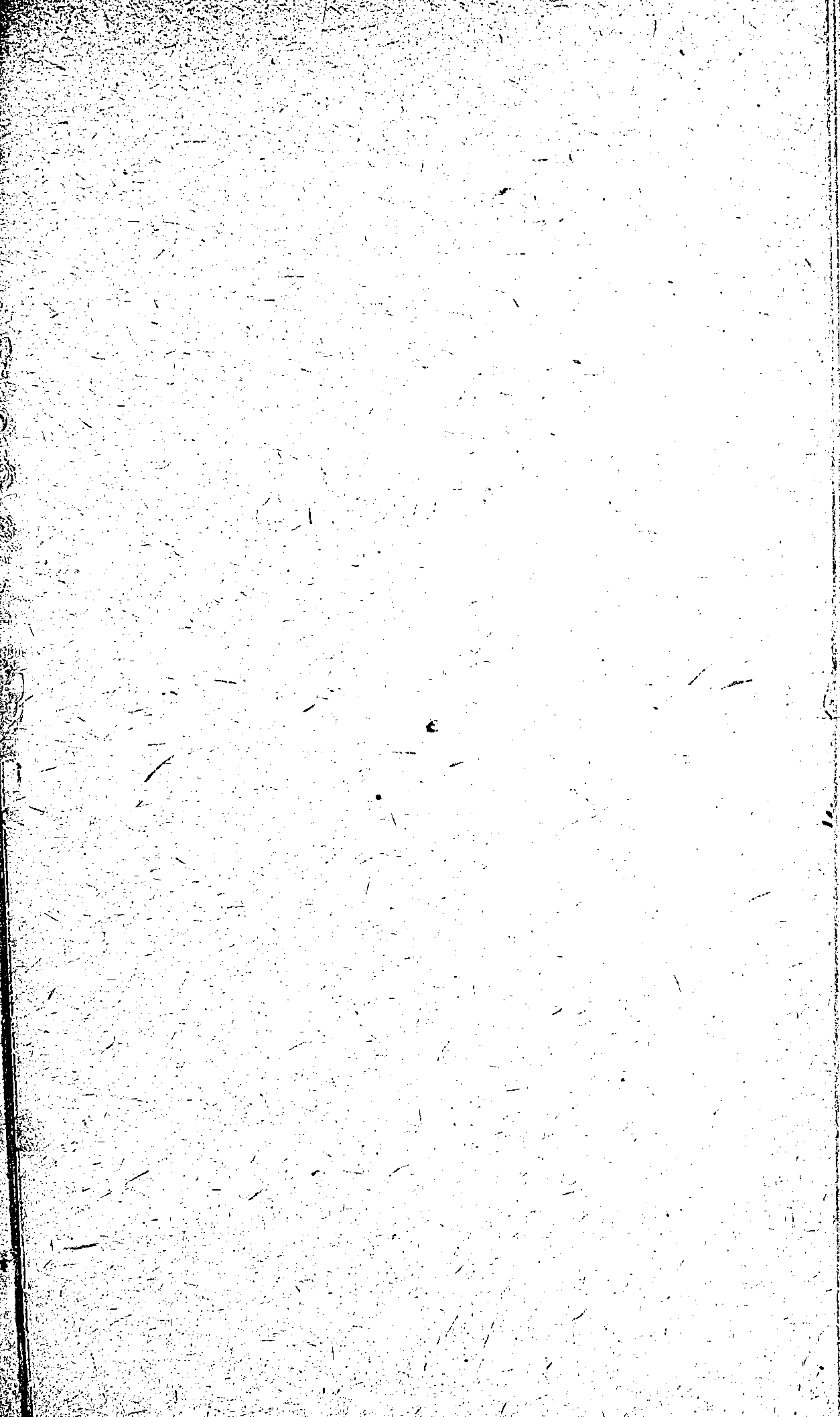
شکل و شباہت

سلطان بیبرسؒ کا قد طویل تھا باختلافِ روایت چھ فٹ سے کچھ کم یا کچھ زیادہ۔ اس کے اعضا نہایت قوی اور متناسب تھے۔ نہایت خوش رُو اور خوش وضع تھا چہرے سے رعب و وقار ٹپکتا تھا۔ رنگ سرخ و سپید تھا بال سُرخ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی ایک آنکھ بچپن میں خراب ہو گئی تھی تاہم اس نقص نے سلطان کی خوش رُوئی اور وجاہت پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا۔

شوقِ جہاد

شوقِ جہاد سلطان کے ابوابِ سیرت کا ایک درخشاں باب ہے۔ سلطان کو جہاد کا اس قدر شوق تھا کہ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں گزار دیتا۔ اعدائے دین خواہ وہ تاتاری غارت گروں کی شکل میں ہوں یا صلیبی طالع آزماؤں کی صورت میں وہ ہر وقت ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کے لیل و نہار کا بیشتر حصہ اہتمامِ جنگ و جہاد میں بسر ہوتا تھا۔ گو اس کی فوج میں متعدد قابل جرنیل موجود تھے لیکن ان کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ دشمنانِ اسلام کے خلاف ہر جنگی مہم کی قیادت خود کرے۔ اس کی ولولہ انگیز قیادت اور شوقِ جہاد نے اس کے فوجیوں میں بھی بے پناہ عزم و ہمت اور ناقابلِ تسخیر جذبۂ جہاد پیدا کر دیا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ شوقِ جہاد کے معاملہ میں سلطان بیبرسؒ، الپ ارسلانؒ، عماد الدین زنگیؒ، نور الدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور محمد فاتحؒ جیسے مجاہد فرماں رواؤں

کی صف کا آدمی تھا تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

شجاعت

سلطان اپنے دور کے شجاع ترین آدمیوں میں سے ایک تھا۔ مشہور امریکی مؤرخ ہیرلڈ لیم اپنی کتاب "تاتاریوں کی یلغار" میں لکھتا ہے:

"ایک سپاہی کی حیثیت سے بیبرس کا مرتبہ "جولیس سیزر" سے کم نہ تھا"۔[۱]

سلطان فی الحقیقت ایک صف شکن سپاہی۔ ایک بے مثل شہسوار اور ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ وہ تیر اندازی، گھڑ سواری، چوگان، تیراکی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی میں کمال درجے کی مہارت رکھتا تھا۔ میدانِ جنگ میں وہ ہمیشہ سب سے اگلی صف میں ہوتا تھا اور بعض اوقات تن تنہا دشمن کی صفوں میں گھس جاتا تھا۔ جب جنگ کی آگ تیزی سے بھڑک رہی ہوتی تو وہ میدانِ جنگ میں برق رفتاری سے اِدھر سے اُدھر چکر لگاتا رہتا تھا اگر کسی جگہ اپنی فوج میں کمزوری کے آثار دیکھتا تو فی الفور وہاں پہنچتا

---

[۱] یہ سب سے بڑا خراجِ تحسین ہے جو ایک غیر مسلم مؤرخ سلطان بیبرس کی شجاعت کو پیش کر سکتا تھا۔ رومی جرنیل جولیس سیزر (۱۰۰ قبل مسیح تا ۴۴ قبل مسیح) کا شمار تاریخِ عالم کے عظیم ترین جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ مغربی مؤرخین اس کی شجاعت اور جرأت و بسالت کی تعریفیں کرتے کرتے نہیں تھکتے۔ فی الواقع وہ ایک بہترین جرنیل اور نہایت بہادر سپاہی تھا۔ اس نے اپنی عسکری قابلیت اور ذاتی شجاعت کے بل پر بے شمار جنگیں لڑیں یہاں تک کہ جزائر برطانیہ پر حملہ آور ہوا۔ اگر مغربی مؤرخین بیبرس کو جولیس سیزر کا ہم پلہ ٹھہرائیں تو اس سے بڑھ کر اس کی عظمت کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے؟

اور بے دریغ دشمن کی صفوں میں گھس جاتا اور جب تک ان کو درہم برہم نہ کر لیتا پیچھے نہ ہٹتا۔ دشمن خواہ کیسا ہی طاقتور ہو اور حالات خواہ کیسے ہی ناسازگار ہوں وہ مطلق ہراساں نہ ہوتا تھا بلکہ اس قسم کی صورتِ حال اس کے جذبۂ شجاعت کو اور اُبھار دیتی تھی صلیبی اور تاتاری اس کے نہایت طاقتور دشمن تھے لیکن وہ ان کا مذاق اڑایا کرتا تھا اور میدانِ جنگ میں ان کو اس طرح للکارتا تھا جیسے شیر ببر جنگل میں دھاڑ رہا ہو۔ اس کی للکار سے دشمنوں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا اور اپنوں کی ہمتیں دوچند ہو جاتی تھیں۔ اس کی بے مثال شجاعت، جراُت و بسالت اور حد درجہ کی ثابت قدمی کو مغربی مؤرخین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ گو انہوں نے سلطان کے ذاتی کردار پر کیچڑ اُچھالنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور اس کو مکار حریص، کانا اور کینہ توز کہہ کر اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کیا ہے لیکن وہ صداقت ہی کیا جو کذب و افترا اور طعن و تمسخر کے ہزار پردوں سے بھی چھن کر باہر نہ آ جائے۔ وہ اس حقیقت کو نہیں جھٹلا سکے کہ منصورہ میں لوئیس نہم ("مقدس بادشاہ") کے صلیبی لشکر کا قلب توڑنے، عین جالوت میں تاتاریوں کے مہیب لشکر کے پرخچے اڑانے اور پھر بعد کی بے شمار جنگوں میں دشمنوں کو لوہے کے چنے چبوانے میں سلطان کی عسکری قابلیت کے ساتھ ذاتی شجاعت کا بھی بڑا حصہ تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ایک غیر جانب دار مبصر بھی سلطان کے واقعاتِ زندگی پڑھ کر یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گا کہ بیبرس تاریخِ عالم کے شجاع ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا اور حقیقی معنوں میں اس شعر کا مصداق تھا ؎

وہ جس کی تیغِ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے
وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے

(حفیظ جالندھری)

سخت کوشی

سلطان کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا تھا اس کے ذرّہ ذرّہ میں سخت کوشی اور صعوبت کشی رچی ہوئی تھی۔ پھر اس کو جہاد فی سبیل اللہ سے جو والہانہ عشق تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ سادگی اور سخت کوشی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے۔ چنانچہ وہ ایک عظیم مملکت کا باجبروت فرماں روا ہونے کے باوجود اس قدر سخت کوش اور صعوبت کش تھا کہ ایک عام آدمی اس کا تصور کر کے بھی لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ رعایا کی خبر گیری کے لیے، مملکت کے کسی مفاد کی خاطر یا جنگ و جہاد کے لیے پیادہ پا یا گھوڑے کی ننگی پلیٹھ پر بیسیوں میل سفر کرتے رہنا اس کا دل پسند مشغلہ تھا اور شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیر اندازی، تیراکی، چوگان اور دوسرے سپاہیانہ کھیل اس کے محبوب مشاغل تھے جن میں وہ پہروں مصروف رہتا۔ منصب حکومت نے اس کو سہل انگاری، عافیت پسندی اور عیش و عشرت کی طرف راغب کرنے کے بجائے پہلے سے بھی زیادہ سخت کوش بنا دیا تھا۔ اس کو شاہانہ چونچلوں راگ و رنگ کی محفلوں اور عیش و عشرت کے جلسوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ بلکہ اس کی زندگی

ع "سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں"

کے محور کے گرد گھومتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ راتوں کو جاگتا تھا اس لیے کہ دوسرے سُکھ کی نیند سوئیں۔ وہ گھر کا آرام اور اہل و عیال کا ساتھ چھوڑ کر کئی کئی دن اور کئی کئی مہینے طویل اور پُرصعوبت سفر کرتا رہتا تھا اس لیے کہ دوسرے امن اور چین سے اپنے گھروں میں رہیں اور اپنے بال بچوں کی خوشیوں کے سامان فراہم کریں۔ وہ محلوں کی پُرامن اور محفوظ زندگی پر میدانِ جنگ کی سختیوں کو ترجیح دیتا تھا اس لیے کہ ملتِ اسلامیہ پر کوئی

آنچ نہ آنے پائے اس کی سخت کوشی، گرمی اور سردی کی شدت۔ برف باری، طوفان باد و باراں اور موسموں کے دوسرے تشدد آمیز کسی شے کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ مؤرخ ابو الفداء لکھتا ہے کہ:

"سلطان بیبرس رات کو زرہ پہنے ہوئے سوجاتا تھا اور پاؤں سے مہمیزیں بھی نہ اتارتا تھا۔"

غرض سخت کوشی سلطان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور اس نے اس کی فتح مندیوں اور کامرانیوں میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

دینداری

سلطان کو حکمرانی و جہانبانی کے ساتھ دینداری میں بے حد انہماک تھا۔ وہ بڑا پرجوش مسلمان تھا۔ جہاد کا عاشق اور شرع کا پابند۔ نہ صرف خود صوم و صلوٰۃ کی پابندی کرتا تھا بلکہ عامۃ الناس کو بھی نہایت سختی سے احکام شریعت پر عمل کرنے اور شعائر دینی کا احترام کرنے کی تاکید کرتا تھا۔ اس نے اپنی مملکت میں تمام ناجائز محاصل یکسر موقوف کر دیے تھے۔ مسکرات کا یک قلم خاتمہ کر دیا تھا اور فواحش کا نہایت سختی سے انسداد کیا تھا۔ اس کی پوری مملکت میں کوئی شراب خانہ، جوئے خانہ اور قحبہ خانہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتا تھا۔

۶۶۷ھ ہجری میں اس نے حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا۔ اس موقع پر اس نے خانۂ کعبہ کو اپنے ہاتھوں سے عرق گلاب سے غسل دیا اور اس پر دیبا کا غلاف چڑھایا۔ پھر مدینہ طیبہ پہنچ کر روضۂ اقدس کی زیارت کی اور اس کے چاروں طرف ایک کٹہرہ (محجر) بنوایا جو آج تک موجود ہے۔ چند سال پہلے مسجد نبوی کا کچھ حصہ آگ لگنے سے گر گیا تھا۔ خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی تعمیر بھی شروع کرائی تھی۔

لیکن سقوطِ بغداد کی وجہ سے یہ کام نامکمل رہ گیا تھا۔ اس کی تکمیل کی سعادت بھی سلطان بیبرس کے حصے میں آئی۔

سلطان کے عہد سے مصر میں صدیوں تک یہ دستور رہا کہ جب محمل شریف کعبہ کے لیے روانہ ہوتا تو پہلے اس کو سارے شہر میں پھرایا جاتا۔ اس کے آگے آگے غلاموں کے اکھاڑے ہوتے تھے جو جگہ جگہ ٹھہر کر شمشیر زنی اور نیزہ بازی کے کرتب دکھاتے تھے ان کو دیکھ کر لوگوں میں یہ فنون سیکھنے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔

جُود و سخا

سلطان عطا و بخشش اور جُود و سخا میں اپنی مثال آپ ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فیاضی اور دریا دلی اس کی فطرت میں ودیعت کی تھی اور اس کی کوئی حد و پایاں نہیں تھی۔ وہ سائلوں کے سوال سے بڑھ کر ان کو عطا کرتا تھا اور ان کی امیدوں سے بڑھ کر سخاوت کرتا تھا۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ اس کی بے حساب بخشش سے مصر کے فقراء اور مساکین مالا مال ہو گئے تھے۔ ایک طرف اہتمام جنگ و جہاد، مدارس، مساجد، شفاخانے اور رفاہِ عامہ کے تمام کام اس کی فیاضی کے خاص مصرف تھے تو دوسری طرف اس کی بذل و عطا آئے دن سحاب کرم بن کر برستی رہتی تھی اور علماء و فضلاء، فقہاء و شعراء، غرباء و مساکین، یتامیٰ و بیوگان اور اہلِ حاجات کا دامن دراہم و دنانیر سے بھرتی رہتی تھی۔ یہ کبھی نہ ہوتا تھا کہ کوئی اس کے دَر پر جائے اور خالی ہاتھ چلا جائے۔

سلطان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا جس سے ہزاروں بندگانِ خدا دونوں وقت متمتع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہزاروں من غلّہ فقراء و مساکین اور اہلِ دنیا میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔ اس نے حرم شریف کے شرفاء و مجاورین کے لیے مستقل

وظائف مقرر کر رکھے تھے خاص خاص موقعوں پر اس کی عطا، وبخشش ان وظائف پہ مستزاد تھی۔

رمضان المبارک میں تو سلطان کی سخاوت کی کوئی حد ہی نہیں رہتی تھی۔ اس کی ہدایت پر جگہ جگہ غرباء و مساکین کے لیے بڑے بڑے مطبخ قائم کر دیئے جاتے جہاں اُن کے افطار و سحر کے لیے طرح طرح کے لذیذ کھانے اور مشروب تیار کیے جاتے تھے۔ اس کام پر لاکھوں دینار صرف ہو جاتے تھے لیکن سلطان کو اس کثیر خرچ پہ دلی مسرت اور روحانی تسکین حاصل ہوتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ کاش اللہ تعالٰے میری اس حقیر خدمت کو قبول فرما لے۔

سلطان کی عطاو بخشش زر و مال اور اجناس کی تقسیم تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ جس کشادہ دلی سے وہ زر و مال اور اجناس تقسیم کرتا تھا اسی کشادہ دلی سے وہ مستحقین کو جاگیریں، صوبے، کنیزیں اور غلام بخشتا رہتا تھا اُس کی اس قسم کی فیاضیوں سے بالعموم ارباب ہنر و کمال اور میدان جنگ میں شجاعت کا مظاہرہ کرنے والے سپاہی فیض یاب ہوتے تھے۔ لاوارثوں اور بے کسوں کی تجہیز و تکفین کے لیے سلطان نے اپنی خاص ملکیت وقف کر دی تھی۔

اہلِ علم وفضل کی قدردانی

سلطان اہلِ علم وفضل کا بے حد قدر دان تھا وہ اُن سے نہایت ادب و احترام سے پیش آتا تھا اور ان کی خدمات کو استحسان کی نظر سے دیکھتا تھا۔ سلطان کوئی اہم دینی یا دنیوی کام علماء سے فتویٰ لیے بغیر نہ کرتا تھا۔ اس کی سلطنت میں چاروں فقہی مسالک کے علماء بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے اور سرکاری خزانے سے گرانقدر تنخواہیں پاتے تھے جن کی مجموعی مقدار لاکھوں دینار تک پہنچتی تھی۔ اس

کی مجلسوں میں اہلِ فضل وکمال کا اجتماع رہتا تھا اور وہ اُن پر درہم و دینار کی بارش کرتا رہتا تھا۔ اس کے دورِ حکومت کے آغاز میں شیخ الاسلام علامہ عزالدّین بن عبدالسلام دمشقی رح کا اس قدر اثر تھا کہ وہ ان کے مشورہ اور تائید کے بغیر ایک قدم تک نہ چلتا تھا جب انہوں نے رحلت کی تو سلطان فرطِ غم سے نڈھال ہو گیا اور کئی دن تک کاروبارِ سلطنت میں حصہ نہ لیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

"علامہ عزالدّین جب تک زندہ تھے حقیقت میں حکومت اُنہی کی تھی کیونکہ اُن میں علم کے ساتھ عمل بھی تھا میری حکومت اُن کی وفات کے بعد شروع ہوئی۔"

سلطان علمائے دین کو اس قدر اہمیت دیتا تھا کہ اس نے مملکوں کی فوج کے ہر دستے کے لیے ایک فقیہ مقرر کر رکھا تھا جو اُن کو قرآن و حدیث، دینی مسائل اور نوشت و خواند کی تعلیم دیتا تھا۔ اسی طرح اس نے فوج کے لیے ایک الگ قاضی القضاۃ مقرر کر رکھا تھا جس کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ سلطان عدالتِ عظمیٰ کے اجلاس میں اُس کو اپنے ساتھ بٹھاتا تھا۔ اہم ملکی اور مذہبی عہدوں پر تقرر کے لیے سلطان ہمیشہ ایسے لوگوں کا متلاشی رہتا تھا جن کی قابلیت اور علم و فن مسلّم ہو۔ چنانچہ اس نے بعض خدمات کے لیے ایسی نادرۂ روزگار شخصیتوں کو منتخب کیا کہ اس کی مردم شناسی کی داد دینی پڑتی ہے۔

مشہور مؤرخ اور تذکرہ نگار علامہ ابن خلکان رح سلطان کے ہم عصر تھے وہ عرصہ تک سلطان کی طرف سے شام کے قاضی القضاۃ رہے، وہاں سے فارغ ہوئے تو قاہرہ آ گئے اور یہاں کے مدرسہ فخریہ میں تعلیم و تعلّم کی خدمت سنبھال لی۔ علامہ قاضی جمال الدین محمد بن سالم معروف بہ ابن واصل جو امامِ وقت اور سرآمد روزگار علماء میں تھے سلطان کی طرف سے حماۃ کے قاضی القضاۃ تھے ان کی

ہمہ گیر قابلیت کے پیشِ نظر سلطان نے ۶۵۹ھ میں اُن کو ایک اہم سفارتی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اپنا سفیر بنا کر اطالیہ و سسلی کے جرمن فرماں روا مینفرڈ (Emperor Manfred) کے پاس اٹلی بھیجا جہاں وہ عرصہ تک نہایت کامیابی سے سفارتی فرائض انجام دیتے رہے۔

سلطان کا "صاحب دیوان الانشاء" یا "وزیر خارجہ" امیر فخر الدین بن لقمان تھا۔ وہ جس طرح علم و فضل اور سیاسی بصیرت کے لحاظ سے حیرت انگیز صلاحیتوں کا مالک تھا اسی طرح "فن انشاء" میں بھی غیر معمولی مہارت رکھتا تھا۔

مشہور محدث امام نوویؒ بھی سلطان کے ہم عصر تھے۔ ان کی جلالتِ علمی نے ایک عالم کو مسخر کر رکھا تھا۔ سلطان بھی ان کے کمالِ علمی کا معترف تھا اور ان کی بیحد تعظیم و تکریم کرتا تھا لیکن افسوس کہ اخیر عمر میں سلطان اور امام موصوف کے درمیان ایک معاملہ میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا جو امام موصوف کی دمشق سے جلا وطنی پر منتج ہوا (اس واقعہ کی تفصیل امام نوویؒ کے حالات میں اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ درج ہے) اس افسوسناک واقعہ سے قطع نظر سلطان کی سیرت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اربابِ فضل و کمال کا دل و جان سے قدردان تھا اور ہر طبقہ کے اہلِ کمال خواہ وہ علماء و فقہاء ہوں یا صلحاء و صوفیاء، سبھی اس کا مرجعِ عقیدت تھے اور وہ ان کی توقیر و تعظیم اور قدردانی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ مشہور صوفی بزرگ سید احمد البدویؒ جن کے حالات اس کتاب میں ایک دوسری جگہ درج ہیں، سلطان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ سلطان بھی ان کا بیحد احترام کرتا تھا اور ان کے قدم چومتا تھا۔

مختلف زبانوں پر عبور

سلطان نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے اور اس

کو مختلف اقوام کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا۔ فلکِ شعبدہ باز نے کبھی اس کو دشتِ قبچاق میں ایک نوجوان گڈریے کی صورت میں دیکھا ــــ کبھی اس کو دمشق میں بردہ فروشوں کی منڈی میں بکتے دیکھا۔ کبھی دمشق اور مصر کے امراء کی چاکری کرتے دیکھا کبھی میدانِ رزم میں ایک صف شکن سپاہی کے رنگ میں دیکھا۔ کبھی اسلامی لشکر کے کماندار کی حیثیت میں دیکھا وعلیٰ ھذا القیاس ــــ چنانچہ اس نے اپنی ہنگاموں سے بھرپور زندگی میں ہر قسم کے لوگوں سے ربط و ضبط کی بدولت بہت سی زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ وہ عربوں سے عربی میں۔ تاتاریوں سے تاتاری میں۔ یونانیوں سے یونانی میں، حبشیوں سے حبشی میں اور کئی دوسری اقوام کے لوگوں سے ان کی اپنی بولی میں نہایت بے تکلفی اور روانی سے گفتگو کر لیتا تھا اس کی ہمہ گیر زبان دانی کا اعتراف نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم مؤرخین بھی کرتے ہیں۔

معدلت گستری

سلطان اگرچہ حکومت کے دشمنوں، غداروں، سازشیوں اور میدانِ جنگ سے بھاگنے والوں کے حق میں نہایت سخت گیر اور قہار واقع ہوا تھا لیکن وہ اس بات پر غیر متزلزل یقین رکھتا تھا کہ بے لاگ عدل ایک مہذب اور بالخصوص ایک اسلامی حکومت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی دلی آرزو تھی کہ اس کے تمام ممالک محروسہ عدل و انصاف کا گہوارہ بن جائیں۔ قاضی مجسمۂ انصاف ہوں اور محتسب پیکرِ دیانت۔ نہ کسی پر ظلم ہو اور نہ کوئی ظالم کی رعایت کرے۔ اس نے محکمہ قضاء میں چاروں فقہی مسالک کے قابل ترین قضاۃ مقرر کر رکھے تھے اور عدلیہ کی نگرانی اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔ قضاۃ کے انتخاب کا معیار اس کے نزدیک یہ تھا کہ وہ عدل و انصاف کے معاملہ میں فرمانروائے وقت تک کی پروا نہ کریں اور امیر و غریب

میں مطلق کوئی امتیاز روا نہ رکھیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ابن کثیر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ

"۹ رجب ۶۶۱ھ ہجری کو ایک کنوئیں کے معاملہ میں رکن الدین بیبرس، قاضی تاج الدین کی عدالت میں آیا۔ اس وقت جتنے لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے وہ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ قاضی نے بھی کھڑا ہونا چاہا مگر ملک ظاہر نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں منع کر دیا۔ اب عدالت میں باقاعدہ مقدمہ پیش ہوا۔ سلطان نے حکم شرعی کے مطابق مدّعی ہونے کی حیثیت سے بینۂ عادلہ پیش کیا اور فیصلہ اسی کے حق میں ہو گیا۔"[1]

سلطان ہفتہ میں دو یا تین دن خود بھی دار العدل میں بیٹھ کر لوگوں کی فریاد رسی کیا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی مملکت میں کوئی شخص ظلم اور ناانصافی کا شکار تو نہیں ہو رہا وہ اکثر بھیس بدل کر گشت کیا کرتا تھا ظالم اس کے نزدیک اعدائے حکومت کا درجہ رکھتے تھے اور وہ ان کو قرار واقعی سزا دینے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیتا تھا۔ اگرچہ عیسائی مؤرخین نے اس کے "ظلم و ستم" کی کئی فرضی داستانیں بیان کی ہیں لیکن تمام مسلم مؤرخین اس کو ایک خدا ترس اور عادل حکمران قرار دیتے ہیں۔

بیدار مغزی

بیدار مغزی سلطان کی کتاب زندگی کا ایک دلآویز اور درخشاں باب ہے جسے

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال از مولانا سعید احمد اکبر آبادی بحوالہ حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۶۶۔

مشرقی اور مغربی تمام مؤرخین نے مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ کسی فرماں روا کی بیدار مغزی کا اندازہ عام طور پر اس کے نظامِ حکومت کو دیکھ کر کیا جاتا ہے اور اپنے بہترین نظامِ حکومت کی بنا پر بیبرسؒ کو بغیر کسی تکلف کے، ایک بیدار مغز حکمران قرار دیا جا سکتا ہے لیکن فی الحقیقت رعایا کی خبرگیری اور ملک کے اندرونی و بیرونی معاملات کی جزئیات تک میں ذاتی دل چسپی لینے کے لحاظ سے وہ تمام مسلم سلاطین میں نمایاں اور منفرد نظر آتا ہے۔ تاریخ میں بلاشبہ خال خال ایسے حکمرانوں کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جو رعایا کی خبرگیری کے لیے کبھی کبھار اپنی سلطنت میں گشت کیا کرتے تھے لیکن سلطان بیبرسؒ اس معاملہ میں سب سے بازی لے گیا تھا۔ دوسرے حکمرانوں کے لیے تو اس قسم کی گشت وقتی اور منہ کا ذائقہ بدلنے کی حیثیت رکھتی تھی لیکن بیبرسؒ اس کو اپنی ذاتی ذمہ داری سمجھتا تھا اور بھیس بدل کر رعایا اور مملکت کا حال معلوم کرتے رہنا اس نے اپنے معمولاتِ زندگی میں شامل کر رکھا تھا۔ اس میں نہ وقت کی قید تھی اور نہ فاصلے کی۔ نہ کسی شہر کی تخصیص تھی اور نہ دیہات کی یہاں تک کہ دشمن کے علاقے بھی اس کی ترکتازیوں کی جولاں گاہ تھے اس پر طرہ یہ کہ وہ اس کام میں کسی کی مدد لینا گوارا نہ کرتا تھا۔ بلکہ اکثر تن تنہا اپنی اقامت گاہ سے اس طرح نکل کھڑا ہوتا تھا کہ اس کے گھر والوں کو بھی خبر نہ ہوتی تھی۔ بعض اوقات تو دارالخلافہ سے اس کی غیر حاضری کئی کئی دنوں اور ہفتوں پر محیط ہوتی تھی لیکن رعب و دبدبہ اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ نظمِ مملکت میں ذرہ برابر خلل نہ پڑتا تھا۔ امریکی مؤرخ ہیرلڈ لیم نے بیبرس کی اس قسم کی سرگرمیوں کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"اسے اپنے سوا کسی پر اعتبار نہیں اس لیے وہ بھیس بدل کے گشت لگاتا ہے اور اپنے لیے خود مخبری کرتا ہے . . . . . .

وہ اپنے ہم پایہ، ہم نوالہ ساتھیوں کو چھوڑ کے تن تنہا نکل جاتا ہے

اور اگلے روز فلسطین میں نمودار ہوتا ہے۔ چار یوم بعد دشتِ عرب میں نظر آتا ہے اس میں خانہ بدوشوں کی تیز رفتاری اور دُور رسی کی خداداد صلاحیت ہے۔

اس کے معرکوں کی وجہ سے قاہرہ کے عوام اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس سے خائف بھی رہتے ہیں۔ کیونکہ معلوم نہیں بیبرس اس وقت کہاں ہو۔ کہیں وہ دراز قد مملوک جو صلاح الدین کی فصیل کے بُرج سے ان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ بیبرس تو نہیں۔ کہیں وہ لمبا سا سوار جو چیتوں کو ساتھ لیے بھیڑوں کی چراگاہوں کے اُس پار بارہ سنگھوں کا شکار کر رہا ہے، بیبرس نہ ہو یا قاضی کے زانو بہ زانو جو سمرقندی حاجی بیٹھا ہوا وظیفہ پڑھ رہا ہے، کہیں وہی بیبرس نہ ہو۔"[1]

معرکۂ عین جالوت کے بعد جب ہلاکو مصر پر انتقامی حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بیبرس نے ایک عجیب کارنامہ سرانجام دیا۔ بظاہر یہ واقعہ الف لیلہ کی کسی کہانی کا حصہ معلوم ہوتا ہے لیکن مؤرخین نے جس تواتر سے اسے نقل کیا ہے اسے دیکھ کر اس کی صحت میں چنداں شبہ نہیں رہتا۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے زیبِ داستاں کے لیے اس میں کچھ بڑھا بھی دیا ہو۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن بیبرس نے (ایک مغنّی یا تاتاری سپاہی کا)

---

[1] یہ اقتباس ہیرلڈ لیمب (Harold Lamb) کی تصنیف (The March of Barbarians) سے لیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جناب عزیز احمد نے "تاتاریوں کی یلغار" کے نام سے کیا ہے۔ اقتباس کے الفاظ انہیں کے ہیں۔

بھیس بدلا اور تن تنہا شمال کی طرف غائب ہو گیا۔ کئی دن کے پرصعوبت سفر کے بعد وہ تاتاریوں کے علاقے میں نمودار ہوا اور قریہ قریہ پھر کر وہاں کے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ مختلف زبانوں میں مہارت رکھنے کی بدولت وہ ہر قسم کے لوگوں میں بآسانی گھل مل جاتا تھا اس لیے کسی کو اس پر مطلق کوئی شبہ نہ ہوا۔ ایک دن اس نے تاتاری علاقے کے کسی شہر میں ایک نانبائی کی دکان پر کھانا کھایا اور ایک برتن میں اپنی شاہی انگوٹھی اتار کر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ اپنے علاقے میں واپس آ گیا اور وہاں سے تاتاری فرماں روا کو خط لکھا کہ

"میں تمہاری مملکت کے حالات کا معائنہ کرنے کے لیے فلاں فلاں جگہ گیا تھا۔ فلاں شہر میں فلاں نانبائی کی دکان پر اپنی شاہی انگوٹھی بھول آیا ہوں۔ مہربانی کر کے یہ انگوٹھی تلاش کر کے مجھے واپس بھجوا دو کیونکہ یہ مجھے بہت پسند ہے۔"

تاتاری بادشاہ سلطان کی اس جرأت و جسارت پر ششدر رہ گیا اور اس نے نانبائی سے انگوٹھی برآمد کر کے سلطان کو بھجوا دی۔ ہیرلڈلیم لکھتا ہے کہ:

"معلوم نہیں اس ستم ظریفی کا ہلاکو خان پر کیا اثر ہوا لیکن قاہرہ کے بازاروں میں لوگ یہ قصہ سن سن کر قہقہے لگاتے تھے۔"

بعض روایتوں میں ہے کہ جب اس واقعہ کی شہرت پھیلی تو تاتاری بیبرس کی ہمت اور شجاعت سے خاصے مرعوب بلکہ ہراساں ہو گئے اور سوچنے لگے کہ جس سلطنت کا حکمران اتنا جری اور بیدار مغز ہے اس سے وہ کیسے ٹکر لے سکیں گے؟ فی الحقیقت دشمن کے علاقے میں اس طرح دورہ کرنے سے بیبرس کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ تاتاریوں کو یہ تاثر دے سکے کہ ان کی فوجی تیاریاں اس کی نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ بیبرس نے اس خفیہ دورے میں تاتاریوں کے طریق جنگ کے بارے میں بیش بہا معلومات حاصل کیں اور بعد میں اپنی افواج کو منظم کرنے میں ان معلومات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ایک مرتبہ سلطان ایک عیسائی زائر کا بھیس بدل کر صلیبیوں کے مقبوضہ علاقوں میں جا داخل ہوا اور کئی ماہ تک ان کے فوجی استحکامات کا بھرپور جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً بیس ایسے قلعے دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جو صلیبیوں کی عسکری قوت کا مرکز تھے۔ ایک دن تو اس نے عجیب ستم ظریفی کی۔ اس نے ایک قاصد (ایلچی) کا بھیس بدلا اور ایک ہرن کا شکار لے کر سیدھا انطاکیہ کے (سابق) حاکم بوہمنڈ کے دربار میں جا داخل ہوا۔ انطاکیہ پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد وہ ٹریپولی آ گیا تھا اور ان دنوں وہ اسی شہر میں محصور تھا۔ سلطان نے بوہمنڈ کے سامنے ایلچیوں کے انداز میں عرض کیا:

"عالی جاہ، میرے آقا الملک الظاہر کو بہت افسوس ہے کہ آپ محصور ہونے کی وجہ سے اپنا شکار کا شوق پورا نہیں کر سکتے۔ انہوں نے یہ تازہ شکار آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ میرے آقا آپ کے شکر گزار ہوں گے۔"

جب سلطان قلعے سے باہر چلا گیا تو بوہمنڈ کو کسی نے آ کر بتایا کہ یہ قاصد خود الملک الظاہر بیبرس تھا۔ یہ سن کر بوہمنڈ کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

ساتویں صلیبی جنگ (۱۲۷۰ء) میں لوئیس نہم اور اس کے حلیفوں کا صلیبی لشکر ٹیونس میں جس طرح تباہ و برباد ہوا اس کا ذکر ایک دوسری جگہ آ چکا ہے۔ بعض مسلم مؤرخین کا بیان ہے کہ سلطان بیبرس لوئیس نہم کی مجنونانہ یلغار کی خبر سن کر خود بھیس بدل کر اپنے

چند معتمدوں کے ساتھ ٹیونس پہنچا اور ٹیونسی فوج کو اعلیٰ درجہ کی جنگی چالیں سکھانے کا اہتمام کیا — اس مہم سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ صلیبی فوج کو مشرقِ وسطیٰ میں قدم رکھنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔ چنانچہ اپنی بیدار مغزی کی بدولت وہ اس مقصد کے حصول میں پوری طرح کامیاب ہُوا۔

سلطان بیبرسؒ کے بارے میں اس قسم کے کئی محیّر العقول واقعات صدیوں تک عرب ممالک کے قہوہ خانوں اور مجالسِ لطف و تفریح کی جان بنے رہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان واقعات میں کسی قدر مبالغہ آرائی کا دخل بھی ہو لیکن ان کو محض بے اصل کہہ کر ردّ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ موافق اور مخالف سبھی مؤرخین نے سیرتِ بیبرسؒ کے اس پہلو کا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ذکر کیا ہے۔ ایسے واقعات کو بیبرسؒ کی جرأتِ رندانہ سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن ہم انہیں اس کی بیدار مغزی ہی کا ایک پہلو سمجھتے ہیں کیونکہ ایسے خفیہ دوروں سے سلطان کا مقصد ایک طرف تو عام لوگوں کے دکھ درد اور ان کے دوسرے مسائل سے واقفیت حاصل کرنا تھا اور دوسری طرف اپنی مملکت کو دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ چنانچہ اس کی بیدار مغزی نے جہاں اسے اپنے عوام کی آنکھوں کا تارا بنا دیا تھا وہاں دشمنوں کے دلوں پر اس کی ایسی ہیبت طاری کر دی تھی کہ وہ اس کا نام سن کر تھرّاتے تھے۔

عسکری قابلیّت

الملک الظاہر بیبرسؒ ان معدودے چند مسلمان جرنیلوں میں ہے جن کی غیر معمولی عسکری قابلیت کا صرف اپنوں ہی نے نہیں بلکہ بیگانوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔ مسلم مؤرخین اگر اس کو موسیٰ بن نصیرؒ، طارق بن زیادؒ، الپ ارسلانؒ، نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ کے پایہ کا جرنیل سمجھتے ہیں تو غیر مسلم مورخین اس کو

جولیس سیزر کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ سلطان کو ایک معمولی حیثیت سے تخت حکومت تک پہنچانے میں جو عوامل کارفرما ہوئے ان میں اس کی ذاتی شجاعت اور عسکری قابلیت کا سب سے نمایاں حصہ ہے سلطان جس طرح ذاتی طور پر تمام فنون جنگ دگھوڑے کی سواری، شمشیر زنی۔ تیر اندازی اور نیزہ بازی وغیرہ میں یکتا تھا۔ اسی طرح وہ جنگی منصوبوں اور نقشوں کی تیاری میں بھی کمال درجے کی مہارت رکھتا تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگ وجہاد میں گزرا اور منصورہ کی جنگ سے آبلستین کے معرکہ تک وہ بیسیوں چھوٹے بڑے معرکوں میں شریک ہوا۔ ہر محاذ اور ہر معرکہ میں اس نے اپنی بے پناہ عسکری قابلیت اور قائدانہ صلاحیتوں کا ایسا بھرپور مظاہرہ کیا کہ فتح ونصرت نے ہر جگہ اس کے قدم چومے۔ اس کے معرکوں اور عسکری نظام کی تفصیل دوسرے ابواب میں درج ہے۔ اس پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا کہ وہ ایک عظیم قائد لشکر اور فوجی ماہر تھا۔ اس کی جنگی چالیں اور حملہ کے طریقے ایسے حیرت انگیز ہوتے تھے کہ دشمن بوکھلا جاتا تھا اور راہ فرار اختیار کرنے یا ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کی فوج کا ایک حصہ برق رفتار دستوں پر مشتمل ہوتا تھا جو گوریلا جنگ لڑنے میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ وہ اپنی فوج کو جس سرعت سے حرکت میں لاتا تھا، دشمن اس کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ بعض دفعہ وہ کسی قلعہ کے محاصرہ میں شدت سے مصروف ہوتا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا کہ یہ محاصرہ طویل عرصہ تک جاری رہے گا لیکن ایک دن وہ یکایک محاصرہ اٹھا کر کسی دوسرے قلعہ پر حملہ کر دیتا اور اس کو آناً فاناً فتح کر لیتا۔ کبھی وہ اپنی افواج کے ہمراہ ایک خاص سمت کو روانہ ہوتا اور دوسری سمت کا دشمن اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتا لیکن ہوتا یہ کہ سلطانی افواج برق رفتاری سے اپنا رخ بدل کر دوسری طرف کے مطمئن دشمن پر حملہ کر دیتیں اور اس کو خاک چاٹنے پر مجبور کر

دینیں۔ ارضِ شام و فلسطین میں صلیبیوں نے بہت سے مقامات پر مستقل ڈیرے ڈال رکھے تھے اور وہاں نہایت مستحکم قلعے تعمیر کر لیے تھے سلطان نے ان کو جس طرح ایک ایک قلعے سے نکالا وہ اس کی عسکری قابلیت کا بیّن ثبوت ہے۔ سلطان نے خبر رسانی اور جاسوسی کا ایسا عمدہ انتظام کر رکھا تھا کہ اس کو دشمن کے بدعزائم کا فوراً علم ہو جاتا تھا اور وہ دشمن کو جارحانہ اقدام کرنے سے پہلے ہی اس کے اپنے مستقر میں جا دبوچتا تھا۔ اپنے ملک کے اندر رہ کر محض دفاعی جنگ لڑنا اس کے نزدیک کمزوری کی دلیل تھی۔ چنانچہ وحشی تاتاریوں کو بھی اس نے کبھی سرزمین مصر پر قدم نہ رکھنے دیا اور ہر بار خود آگے بڑھ کر ان سے معرکہ آرا ہوا اس کا ایک خاص جنگی حربہ "حملۂ بازگشت" تھا۔ اس میں کچھ فوج غنیم کے لشکر کو جنگ میں الجھا لیتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگتی۔ دوسری طرف کچھ چیدہ دستے کمین گاہوں میں گھات لگا کر بیٹھ جاتے جونہی دشمن کا لشکر ان کی زد میں آتا، یہ تازہ دم دستے اس پر نہایت تندی و تیزی سے حملہ کر دیتے۔ اس طوفانی حملے کے سامنے کوئی مضبوط سے مضبوط لشکر بھی مشکل سے ٹھہر سکتا تھا۔ اگرچہ یہ حربہ دشمن بھی استعمال کر سکتا تھا لیکن اس کے تدارک کے لیے سلطان اپنے چند گوریلا دستے میدانِ جنگ میں دُور دُور تک پھیلا دیتا تھا جو دشمن کو چھپنے کا موقع ہی نہ دیتے تھے اور اگر کبھی دشمن گھات لگانے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو یہ دستے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مقابلے پر پہنچ جاتے اور اس کے ارادے خاک میں ملا دیتے۔

سلطان کی نظر جنگ کے ہر پہلو پر رہتی تھی اور دشمن کو کمر شکن شکست دینے کے لیے وہ نہ صرف اپنے تمام وسائل سے کام لیتا تھا بلکہ ہر اس تدبیر پر بھی عمل کرتا تھا جو جنگ جیتنے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ معرکۂ عین جالوت کے بعد جب ہلاکو مصر پر انتقامی حملہ کرنے کے لیے اپنی افواج مجتمع کر رہا تھا تو اس وقت سلطان

نے اس کے مقابلے کے لیے جو تدابیر اختیار کیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس
نے حلب سے لے کر حدودِ عراق تک تمام جنگلوں کی گھاس اور درختوں کو آگ
لگوا دی تاکہ تاتاری اگر ادھر کا رُخ کریں تو نہ ان کے گھوڑوں کو چارہ مل سکے اور
نہ سواروں کو ایندھن کی لکڑی اور درختوں کا سایہ۔ یہ الگ بات ہے کہ ہلاکو خان
کو ادھر آنا نصیب ہی نہ ہُوا اور نہ سلطان نے تاتاری غارت گروں کو عبرت ناک
تباہی سے دوچار کرنے کے لیے پورے سامان مہیا کر رکھے تھے۔

سلطان نے صلیبیوں کے جو قلعے فتح کیے اُن میں سے کچھ کے متعلق مشہور
تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہیں اور واقعہ بھی یہ تھا کہ وہ عرصۂ دراز سے عالمِ اسلام کا منہ چڑا
رہے تھے۔ سلطان کے عزمِ راسخ کے سامنے ان قلعوں کے استحکامات ملیامیٹ
ہو گئے۔ سلطان نے اکثر مفتوحہ قلعوں کو مسمار کر کے زمین کے برابر کر دیا۔ عیسائی
مؤرخین نے سلطان کے اس اقدام پر بڑی لے دے کی ہے اور اس کو وحشیانہ
قرار دیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان قلعوں کا انہدام عسکری نقطۂ نگاہ سے
نہایت ضروری تھا۔ یہ قلعے سالہا سال تک مسلمانوں کے لیے مصیبت بنے رہے
تھے اور ان کا وجود آئندہ بھی مسلمانوں کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا سلطان
نے اسی شر کے دفعیہ کے لیے یہ قلعے مسمار کرائے ورنہ جو قلعے اس کے نزدیک
عسکری لحاظ سے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے تھے، ان کو اس نے نہ
صرف قائم رکھا بلکہ ضروری مرمت کے بعد ان کو مزید مستحکم کر دیا۔

سلطان کا مقابلہ دو طاقتور دشمنوں سے تھا ایک طرف وحشی تاتاری تھے
جنہوں نے عالمِ اسلام کے ایک بڑے حصے کو زیر و زبر کر ڈالا تھا اور دوسری طرف
یورپ کے "مہذب" صلیبی جن کا مذہبی جوش جنون کی حد تک پہنچا ہُوا تھا سلطان
نے ان دونوں حریفوں سے مؤثر طور پر نپٹنے کے لیے فوج کی تنظیم و تربیت پر خاص

توجہ دی اور اُس کو اس زمانہ کے حالات کے مطابق جنگ اور دفاع کی نہایت اعلیٰ تربیت دلائی۔ اس تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ جن تاتاریوں کو اپنی قدر اندازی، شمشیر زنی اور شہسواری پر بڑا ناز تھا سلطان کی فوج نے اُن کا منہ پھیر کر رکھ دیا۔ اسی طرح صلیبی جنگ جو منجنیقوں اور گوپھنوں وغیرہ کے استعمال میں بڑی مہارت رکھتے تھے لیکن سلطانی فوج نے یہی مشینیں نہایت عمدگی سے استعمال کر کے ان کے بڑے بڑے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ غرض پندرہ بیس برس کی معرکہ آرائیوں میں سلطان نے ہر موقع پر اور ہر معرکہ میں اپنی عسکری قابلیت دُور اندیشی اور ذہانت کا لوہا منوا لیا اور اپنے آپ کو تاریخ عالم کے عظیم ترین جنیلوں کی صف میں شمار کرانے کا استحقاق حاصل کر لیا۔

فہم و تدبّر

سلطان کی سیرت کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالیں وہ اتنا تابناک دکھائی دیتا ہے کہ ایک پہلو کو دوسرے پر ترجیح دینا نہایت مشکل ہے۔ مبدأ فیاض نے اسے منجملہ دوسرے اوصاف کے فہم و تدبّر سے بھی حصّہ وافر عطا کیا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے داخلی انتظام میں جس ہوشمندی اور فراست کا ثبوت دیا اور اسے جس نہج پر استوار کیا اس نے ملک العادل نورالدّین زنگیؒ اور مجاہد کبیر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دَور کی یاد تازہ کر دی لیکن اپنی خارجہ حکمت عملی میں تو اس نے ایسے فقید المثال تدبّر کا ثبوت دیا کہ اگر اس کو اپنے دَور کا عظیم ترین سیاست دان اور مدبّر کہا جائے تو اس میں کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ اُس کی خارجہ حکمت عملی (Foreign Policy) کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس شخص نے کس بلا کا دل و دماغ پایا تھا۔ ایک طرف تو اس نے اردوئے زرّیں (قبچاق) کے نومسلم تاتاری حکمران سے گہرے

دوستانہ مراسم قائم کرکے لوہے کو لوہے سے ٹکرا دیا یعنی تاتاریوں کو تاتاریوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔ اور دوسری طرف اس نے یورپ کے متعدد حکمرانوں کو اپنی زبردست شخصیت سے ایسا مرعوب و متاثر کیا کہ وہ اس سے دوستانہ معاہدے کرنے پر مجبور ہو گئے — ایک طرف اس نے شام کی سرحد پر سیلِ تاتار کے سامنے تلواروں کا بند باندھ دیا اور دوسری طرف خلافتِ عباسیہ کا احیاء کرکے قاہرہ کو ملتِ اسلامیہ کی قوت و شوکت کا مرکز بنا دیا — ایک طرف اس نے عکّہ کے صلیبیوں سے بمصلحتِ وقت کے وقت معاہدۂ امن کر لیا اور دوسری طرف وینس اور جنیوا کی عیسائی حکومتوں کو ایک دوسرے سے بھڑا دیا —

غرض سلطان کے فہم و تدبّر نے اس کو اپنے دَور کی ایک اہم ترین عالمی شخصیت بنا دیا تھا۔ وہ نہ صرف بین الاقوامی سیاست سے کمال درجے کی واقفیت رکھتا تھا بلکہ ہر قسم کے حالات سے عہدہ برآ ہونے اور اُن سے مفیدِ مطلب نتائج حاصل کرنے کی بھی کماحقّہٗ صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ تاتاریوں کی دھڑے بندیوں وینس اور جنیوا کی باہمی رقابت۔ جرمنی کی خانہ جنگی۔ فرانس کی کمزوری اور پاپائے روم کے جوڑ توڑ سے ایسا باخبر تھا کہ خود اُن ملکوں کے باشندے بھی اس سے زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔

سلطان کی تیزیٔ فہم اور تدبّر کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات وہ مختلف زبانوں کے کاتبوں کو اپنے سامنے بٹھا لیتا تھا اور مختلف ملکوں کے حکمرانوں کے نام بیک وقت خطوط لکھوانے شروع کر دیتا تھا۔ لطف یہ کہ ہر خط کا مضمون بھی جداگانہ ہوتا تھا اور زبان بھی دوسری۔ وہ چند فقرے ایک کاتب کو لکھواتا پھر پہلو بدلتا اور دوسرے کاتب کو کچھ فقرے لکھوا دیتا ابھی وہ انہیں احاطۂ تحریر میں بھی نہ لانے پاتا تھا کہ سلطان تیسرے کاتب کو لکھوانا شروع کر دیتا حتّٰی کہ جب وہ اُٹھتا تو سارے خطوط مکمل ہو

پھیکے ہوتے۔

امریکی مؤرخ ہیرلڈلیم، سلطان کی ذہانت اور تدبّر کی تصویر ان الفاظ میں کھ
ہے:

"یہ شخص جو میدانِ جنگ اور بردہ فروشوں کے بازار کا فاتح التحصیل ہے، زبانوں کی نوک اور بنارش سے آزاد ہے، کیونکہ جب وہ خود جاری کرتا ہے تو بڑے اطمینان سے یونانیوں سے یونانی میں، عربوں سے عربی میں اور دریائے نیل کے منبع کے حبشیوں سے اُن کی اپنی بولی میں باتیں کرتا ہے۔ کسی اور موقع پر اور کسی اور حیثیت سے وہ اپنے میر منشی سے انجو کے شاہ چارلس اور اہلِ وینس کے نام مراسلے لکھواتا ہے۔ ادھر وہ اہلِ وینس کی تجارتی کشتیاں لوٹ کے نفع حاصل کرتا ہے۔ اُدھر اُن کے دشمنوں یعنی اہلِ جنیوا سے بندرگاہوں پر محصول وصول کرتا ہے۔ ان مغرور شہروں کے سفیروں کو آپس میں لڑا کے مزے سے تماشا دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے تدبّر سے اِن دونوں شہروں کے بیڑوں کے درمیان ارضِ مقدس کے قریب سمندر میں گھمسان کی لڑائی چھڑ جاتی ہے۔"[1]

فی الحقیقت سلطان تدبیر و سیاست اور فہم و فراست کے لحاظ سے ان اعاظم رجال میں سے تھا جن پر ملّتِ اسلامیہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔

شگفتہ مزاجی

سلطان باہمہ ہیبت و جلالت نہایت شگفتہ مزاج اور خندہ رو تھا۔ ایس

---

[1] تاتاریوں کی یلغار۔ ہیرلڈلیم ترجمہ عزیز احمد۔ ص ۲۶۴-۲۶۵۔

بہت کم ہوتا تھا کہ اس پر حالتِ غیظ و غضب طاری ہو۔ اس نے اپنی شگفتہ مزاجی اور دوسرے اوصاف کی بدولت لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ اس کو بے شمار لطیفے اور چٹکلے یاد تھے۔ کسی خاص محفل میں ہوتا تو اپنی بذلہ سنجی سے اس کو کشتِ زعفران بنا دیتا۔ باہر نکلتا تو عام لوگوں سے ہنسی مذاق اور چہل کی باتیں کرتا۔ اس طرح اس کو عوام الناس میں ایسی غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی تھی جو بہت کم حکمرانوں کو نصیب ہوتی ہے ؎

نظمِ مملکت
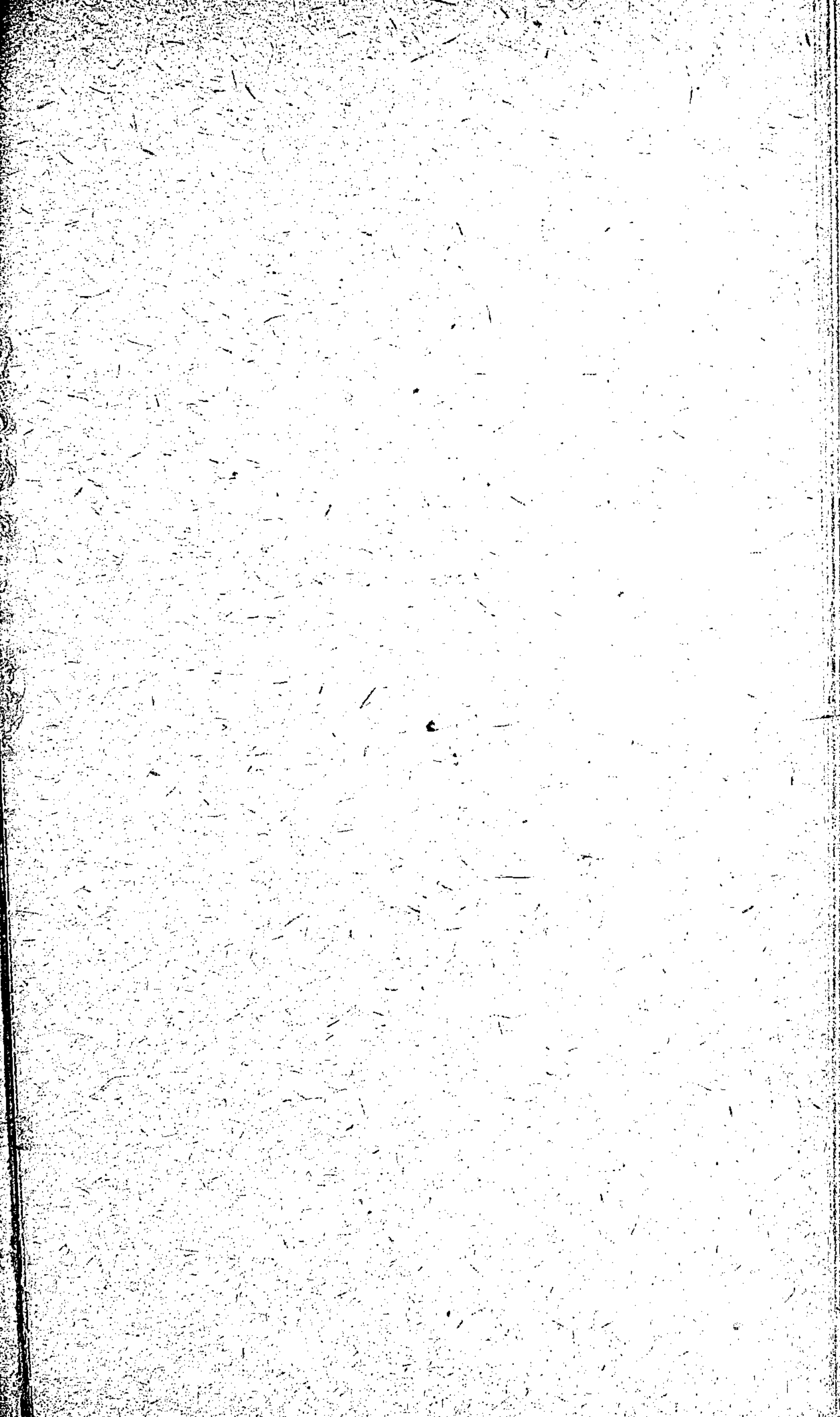
سربراہِ مملکت

مملوک حکومت کے آغاز میں سرکردہ مملوک امراء اپنے گروہ سے کسی کو اپنا صدر یا امیر منتخب کر لیتے تھے۔ یہ امیر منتخب ہو کر بادشاہوں کی طرح تخت نشین ہوتا اور سلطان یا ملک کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ الملک الظاہر سلطان بیبرس بھی اسی طریقہ انتخاب کے ذریعے مسندِ حکومت پر بیٹھا۔ کچھ عرصہ بعد جب اس نے مصر میں خلافتِ عباسیہ کا احیاء کیا تو رسمی طور پر سربراہِ مملکت کی حیثیت خلیفہ کو حاصل ہو گئی۔ خود سلطان، تمام سربرآوردہ امراء، علماء، فقہاء اور ملک کے عوام کی ایک کثیر تعداد نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ خلیفہ کا نام سکوں پر مسکوک ہوا، خطبوں میں داخل کیا گیا اور شاہی فرمانوں پر "مہرِ خلافت" ثبت ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی خلیفہ کو "دربارِ خلافت" کے ظاہری لوازم بھی مہیا کر دیے گئے لیکن حقیقت میں ان سب باتوں کے باوجود یہ خلافت محض نام ہی کی خلافت تھی۔ خلیفہ کی حیثیت ایک تبرک سے زیادہ نہ تھی۔ حکومت اور ملکی معاملات کے انصرام و انتظام میں اس کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔ اس کی سیاسی قوت کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے سلطان بیبرس کو از خود "امیر المومنین" کا لقب دیا۔ حالانکہ خلافت کی روح اور مزاج کا تقاضا یہ تھا کہ خلیفہ کے سوا کسی دوسرے کو اس لقب سے نہ پکارا جائے۔ شاید یہی اسباب تھے کہ دوسرے ممالک کے مسلمان حکمرانوں نے مصر کے عباسی خلفاء کو کبھی کوئی اہمیت نہ دی حالانکہ بغداد کے عباسی خلفاء کا گئی گزری حالت میں بھی اتنا وقار تھا کہ بڑے بڑے طاقتور مسلمان حکمران جو بجائے خود مطلق العنان فرمانروا تھے اور اپنے ملکوں میں ظل اللہ کہلاتے تھے بغداد کے

دربارِ خلافت سے سندِ حکومت حاصل کرنا اپنے لیے مایۂ سعادت اور طرۂ افتخار سمجھتے تھے۔ اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ مملوکوں کے دورِ حکومت میں خلیفہ ایک "معزز قیدی" کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کو مملوک حکمران کے منشاء کے بغیر کسی سے ملنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ مملکت کے حقیقی سربراہ کی حیثیت سلطان ہی کو حاصل تھی۔ سلطان بیبرس نے چونکہ خلافت کا احیاء کیا تھا یا یہ کہ وہ ایک دیندار آدمی تھا اس لیے اُس نے اپنی زندگی میں حتی المقدور کوشش کی کہ خلیفہ کے ادب و احترام پر کوئی آنچ نہ آنے پائے تاہم خلیفہ کو سیاسی امور پر حاوی ہونے کی اس نے کبھی اجازت نہ دی۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا بیان ہے کہ

"سلطان بیبرس نے ۶۶۳ھ میں قصرِ خلافت پر پہرے بٹھا دیئے اور لوگوں کو حکم دیا کہ خلیفہ کے پاس جا کر نہ بیٹھا کریں کیونکہ اکثر لوگ باہر نکل کر بہت سی لایعنی باتیں اڑاتے پھرتے تھے۔"[۱]

حکومت کی ہیئتِ ترکیبی

مملوکوں کے دورِ حکومت میں مرکزیت کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی۔ سلطان بیبرس کے عہد میں بھی یہی کیفیت تھی۔ حکومت کے تمام اہم عہدیداروں اور اہل کاروں کا عزل و نصب سلطان کے ہاتھ میں تھا۔ نہ صرف انتظامی، عدالتی اور عسکری امور پر اس کا مکمل اقتدار تھا بلکہ ملک کا کوئی قانون بھی اس کی مرضی اور منظوری کے بغیر نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ تاہم سلطان نے ایک مطلق العنان فرمانروا (یا آمرِ مطلق) بننے سے احتراز کیا اور تمام معاملات میں صائب الرائے اصحاب

---

[۱] تاریخ الخلفاء للسیوطیؒ

سے ضرور مشورہ کرتا تھا اور پھر ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتا تھا۔ دینی امور میں وہ تمام مسالک کے علماء و فقہاء سے فتویٰ لیے بغیر کوئی حکم جاری نہیں کرتا تھا۔ اسی طرح عدالتی معاملات میں اس نے قاضیوں کو کامل آزادی دے رکھی تھی کہ مقدمات کے فیصلے کسی رو رعایت کے بغیر کریں اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت حتیٰ کہ اس کی اپنی ذات کو بھی خاطر میں نہ لائیں۔ مرکز میں سلطان کے ماتحت اہم عہدیدار اور ان کے فرائض یہ تھے۔

نائب السلطان

سلطان نے ایوبیوں کی تقلید میں "نائب السلطان" کا عہدہ قائم کیا۔ "نائب السلطان" سرکردہ امراء (مقربین بارگاہ) سے منتخب کیا جاتا تھا اور مرتبہ کے لحاظ سے دوسرے تمام وزراء پر فوقیت رکھتا تھا گویا اس کی حیثیت وزیر اعظم کی تھی۔ ضرورت کے وقت وہ تمام امور حکومت میں سلطان کو مشورہ دیتا اور اس کے احکام کو عمل میں لاتا تھا۔ بعض مواقع پر وہ سلطان اور رعیت کے درمیان واسطہ بھی بنتا تھا۔ سلطان جب کبھی دارالحکومت سے باہر جاتا تو حکومت کا نظم و نسق چلانے کی ذمہ داری نائب السلطان ہی کے سپرد ہوتی تھی[1]۔ اس دوران

---

[1] اس زمانہ میں سلطان کو جنگوں اور رعایا کی خبرگیری وغیرہ کے سلسلے میں اکثر دارالحکومت سے باہر جانا پڑتا تھا۔ چونکہ اس کی غیر موجودگی میں کاروبار حکومت چلانے میں دقت ہوتی تھی اس لیے اس عہدہ کا قیام ناگزیر سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے کچھ ایسے انتظامات بھی کر رکھے تھے کہ نائب السلطان کو اپنی خود مختاری اور اقتدار قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا۔

ہیں اس کو سلطان کے مکمل اختیارات حاصل ہوتے تھے یہاں تک کہ وہ جاگیر
بھی دے سکتا تھا اور اعلیٰ عہدوں پہ تقرر بھی کر سکتا تھا۔

وزیر الصحبت

سلطان جب کبھی کسی جنگی مہم یا سرکاری دورے پہ جاتا تو اس کے سا
ایک دوسرا وزیر ہوتا تھا جس کو "وزیر الصحبۃ" کہا جاتا تھا۔ دورانِ سفر میں
سلطان کا مشیر کار ہوتا تھا اور اس کے احکام کو نافذ کرتا تھا۔

استادار یا استاذدار

سلطان کے دربار میں یہ ایک اہم عہدہ تھا اس کے اصطلاحی معنی
"مہتمم امورِ خانہ" (Major Domo) کے ہیں۔ اس عہدہ پر کسی بڑے
امیر کو مقرر کیا جاتا تھا۔ اس کا کام سلطانی محلات کا انتظام کرنا تھا۔

دوادار

دوادار کے ذمے یہ فرض تھا کہ وہ باہر سے آئے ہوئے خطوط کو سلطان
کی خدمت میں پیش کرے اور اس سے کاغذات پر دستخط کرائے۔

امیر جاندار

امیر جاندار "افسر استقبال" کے فرائض انجام دیتا تھا۔ وہ سلطان کی قیام گاہ
کے باہر موجود رہتا تھا اور حکومت کے اعلیٰ افسروں اور عمائد سلطنت کا استقبال کرتا
تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ ایک دربان کی حیثیت رکھتا تھا حقیقت میں

وہ ایک ممتاز عہدیدار تھا اور اس کو طبقۂ امراء سے منتخب کیا جاتا تھا۔

امیرِ مجلس

اس کی خصوصی ذمہ داری سلطان کی حفاظت کرنا تھا گویا وہ اس کا "ذاتی محافظ" تھا اس کو سلطان کے ہمراہ محل کے اندر جانے کی بھی اجازت تھی یہاں تک کہ وہ اس کی خواب گاہ میں بھی جا سکتا تھا۔

امیر السلام

اس کا فرض ہر قسم کے اسلحہ اور سامانِ جنگ کا انتظام کرنا تھا۔

راس نوبۃ الامراء

یہ تمام امراءِ دولت کا افسر تھا اور ان کی حرکات و افعال کا ذمہ دار تھا اس کا فرض تھا کہ وہ کسی امیر کو بے راہرو نہ ہونے دے اور رعیت کو ان کی زیادتیوں سے محفوظ رکھے۔

صاحب دیوانِ انشاء

"دیوانِ انشاء" کو آجکل کی اصطلاح میں وزارت خارجہ کہا جا سکتا ہے! اس کے افسرِ اعلیٰ کو "صاحب انشاء" یا صاحب دیوانِ انشاء" کہا جاتا تھا۔ وہ بیرونی ممالک سے آئے ہوئے خطوط کو سلطان کے سامنے پیش کرتا تھا اور پھر اس کی ہدایت کے مطابق ان کے جوابات لکھتا تھا۔ اس کا ماتحت عملہ کاتبوں کے دو طبقوں پر مشتمل ہوتا تھا ایک کو "کتّاب دست" کہتے تھے اور دوسرے کو

"کتاب الدرج" - اول الذکر سلطان کے سامنے بیٹھتے تھے۔ صاحب الانشا سلطان کے سامنے کاغذات پیش کر کے جو احکام حاصل کرتا تھا، کتاب دست اُن کو سلطان کے سامنے ہی معرض تحریر میں لاتے تھے۔ مؤخر الذکر اُن خطوط اور دستاویزوں کی نقلیں تیار کرتے تھے جو صاحب دیوان الانشا اور کتاب دست مرتب کرتے تھے یہ لوگ خطوط اور فرامین کو ایک مستطیل ورق پر لکھتے تھے جس میں چند جوڑ ہوتے تھے۔ ان دونوں طبقوں کے کاتبوں کی تعداد میں ضرورت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ "صاحب دیوان الانشاء" کی حیثیت سلطان کے پرائیویٹ سیکرٹری (معتمد خصوصی) کی تھی۔ اس کا عہدہ اگرچہ وزیر کے ہم پلہ نہیں تھا لیکن اپنے فرائض کی اہمیت کے پیش نظر وہ نائب السلطان کے بعد حکومت کا سب سے بڑا عہدہ دار سمجھا جاتا تھا۔ فی الحقیقت وہ بیک وقت وزیر خارجہ، فارن سیکرٹری اور پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ سلطان بیبرس کا "صاحب دیوان الانشاء" امیر فخر الدین لقمان تھا جو نہ صرف فن الانشاء میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا بلکہ سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے بھی منفرد حیثیت کا مالک تھا۔

رئیس العسکر

سلطان کی بری افواج کے سپہ سالار کو "رئیس العسکر" یا رئیس العساکر کہتے تھے وہ براہ راست سلطان کے سامنے جواب دہ ہوتا تھا اور فوج کے مختلف دستوں کے تمام سالار (کمانڈر) اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ رئیس العسکر کو عام طور پر مملوک امراء میں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ بڑی بڑی مہموں کی قیادت سلطان خود کرتا تھا یا رئیس العسکر۔ سلطان کے عہد میں جو لوگ رئیس العسکر کے عہدے پر مامور ہوئے ان میں امیر قلاوون الفی (جو بعد میں مصر و شام کا فرماں روا بنا) اور

امیر آقسنقر نے بڑی شہرت پائی۔

امیر البحر

جنگی جہازوں اور بحری فوج کے افسر اعلیٰ کو امیر البحر کہتے تھے۔ جنگی جہازوں کے تمام کپتان (قائد) اس کے ماتحت ہوتے تھے اور وہ خود براہ راست سلطان سے احکام حاصل کرتا تھا۔

امیر التعمیر

یہ مملکت کی تمام تعمیرات کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ سرکاری عمارات کی تعمیر۔ پل باندھنا۔ بند باندھنا۔ نہریں کھدوانا۔ سڑکیں بنانا اور اسی قسم کے دوسرے کام کرانا امیر التعمیر کی ذمہ داری تھی۔ اس کو آجکل کی اصطلاح میں چیف انجینئر (تعمیرات) سمجھنا چاہیئے۔

حکومت کے اہم شعبے

سلطان بیبرس کی حکومت کے اہم شعبے یہ تھے:

۱۔ صیغۂ قضا یا عدالت۔

۲۔ صیغۂ فوج (بری و بحری)

۳۔ محکمۂ پولیس

۴۔ شعبۂ مالیات۔ بیت المال بھی اسی شعبہ سے متعلق تھا۔ ٹیکس (محاصل) کے افسر اعلیٰ کا درجہ وزیر کے برابر تھا۔

۵۔ محکمۂ ڈاک

۶۔ صیغۂ احتساب

۷۔ امور رفاہِ عامہ، ان میں اوقاف۔ مدارس و مکاتب۔ سرائیں۔ مہمان خانے سرکاری عمارتیں۔ شفاخانے۔ پل۔ سڑکیں۔ نہریں اور اسی قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔

۸۔ شعبۂ صنعت و حرفت و تجارت۔ سرکاری و غیر سرکاری صنعتیں اور درآمد و برآمد کی جانے والی سبھی اشیاء اسی شعبہ سے متعلق تھیں۔

ان شعبوں کو چلانے کے لیے الگ الگ دفاتر قائم تھے جن کی شاخیں مرکز اور صوبوں میں ہر جگہ پھیلی ہوئی تھیں ان کو چلانے کے لیے اعلیٰ افسروں سے لے کر چھوٹے ملازموں تک کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جاتا تھا اور اس معاملہ میں قابلیت اور دیانت کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ ان سب شعبوں کی تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔

ملک کی انتظامی تقسیم

سلطان بیبرس کی مملکت کے دو بڑے حصے یا بازو (Wings) تھے مصر اور شام۔ سلطان نے ان دونوں حصوں کو انتظامی اعتبار سے بہت سے صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر صوبہ کو نیابت (نیابہ) کہا جاتا تھا۔ سلطان کی طرف سے ہر ایک صوبہ میں ایک نائب (گورنر) مقرر تھا۔ یہ نائبین (گورنر) بالعموم ارباب سیف ہوتے تھے اور مملوک فوجی امراء میں سے منتخب کیے جاتے تھے ان کا خاص فرض سلطانی احکام کا نفاذ اور خراج اور چنگی وصول کرنا تھا تاہم سلطان نے ان کو داخلی معاملات میں بہت حد تک خود مختاری دے رکھی تھی اور وہ اپنے صوبہ کے داخلی حالات کے مطابق نظم و نسق چلانے میں آزاد تھے چونکہ وہ

صرف مرکز کے سامنے جواب دہ تھے اور ایک کو دوسرے کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہوتا تھا اس لیے مرکزی حکومت کے خلاف ان کے باہم اتحاد کا کوئی امکان نہ تھا۔ سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر کسی گورنر کو زیادہ طویل عرصے تک اس عہدہ پر قائم نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔ بیبرس کے عہد میں شاید ہی کوئی گورنر اپنے عہدہ پر تین سال سے زیادہ رہا ہو۔ گورنر چھوٹے پیمانے پر اسی طرح دربار کرتے تھے جس طرح سلطان قاہرہ میں اپنی نیابت میں وہ منجملہ دوسرے امور کے داخلی امن وامان اور عدل واحتساب کے بھی پوری طرح ذمہ دار تھے۔ سلطان اپنے وقائع نویسوں کے ذریعے گورنروں پر کڑی نظر رکھتا تھا اگر اس کو کسی گورنر کے خلاف بدعنوانی کی شکایت موصول ہوتی تو وہ اس کا پوری طرح محاسبہ کرتا تھا۔

مصر کے بڑے بڑے صوبے یا نیابتیں یہ تھیں:

اشمونین۔ الجیزہ۔ بہنسا۔ قوص۔ بلبیس۔ دمنہور۔ دمیاط۔ قلیوب۔

محلۃ الکبریٰ۔ منوف۔

شام کے اہم صوبے یہ تھے:

دمشق۔ حلب۔ حماۃ۔ صفد۔ الکرک اور طرابلس (اس میں طرابلس کا

شہر شامل نہیں تھا کیونکہ اس پر صلیبیوں کا قبضہ تھا)

ان میں دمشق کا صوبہ سب سے بڑا تھا۔ یہ بیروت، حمص اور تدمر تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں لبنان اور فلسطین کے کئی علاقے بھی شامل تھے۔ سلطان کے ممالک محروسہ میں قاہرہ کے بعد دمشق کا درجہ تھا اور وہ یہاں اکثر آ کر دربار کیا کرتا تھا۔ لبنان اور فلسطین کے جو حصے صوبہ دمشق میں شامل نہیں تھے وہ دوسرے صوبوں میں ضم کر دیے گئے تھے۔

صیغۂ عدالت

بے لاگ عدل کو اسلام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے چنانچہ مسلمان حکمران بالعموم عدلیہ کو خاص اہمیت دیتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی حکمران نے اس پر کم توجہ دی اور کسی نے اس کو ایک اسلامی حکومت کا مقصدِ وجود قرار دے کر دوسرے تمام محکموں پر فوقیت دی۔ سلطان بیبرس مسلم حکمرانوں کے مؤخر الذکر طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سے پہلے خلفائے بنو اُمیہ، بنو عباس اور بنو فاطم کے دورِ عروج میں نظامِ عدالت بھی اوجِ کمال پر پہنچا ہوا تھا لیکن ان کے دورِ انحطاط میں نظامِ عدالت میں بھی انحطاط رونما ہو گیا اور اس میں جگہ جگہ رخنے پڑ گئے۔ سلطان نورالدین محمود زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ نے اپنے ممالکِ محروسہ میں نظامِ عدالت کو پھر صحیح بنیادوں پر قائم کیا اور اپنی انصاف پسندی اور معدلت گستری سے خلفائے راشدینؓ کے مبارک عہد کی یاد تازہ کر دی۔ ان کے بعد نظامِ عدالت میں پھر اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے اور اس میں کئی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ بہر صورت عدلیہ کا ڈھانچہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔ ممالیک کی حکومت کا آغاز ہوا تو پہلے تین مملوک حکمرانوں کو تو نظمِ مملکت کی طرف توجہ کرنے کی مہلت ہی نہ ملی البتہ جب مسندِ اقتدار بیبرس کے قبضے میں آئی تو اس نے عدلیہ کی طرف خاص توجہ دینی شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے ممالکِ محروسہ کے اندر ایک مثالی نظامِ عدالت قائم کر دیا۔ اس کے نظامِ عدالت کی صورت یہ تھی :۔

محکمۂ قضاء

شروع شروع میں تمام ملک میں ایک ہی قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) تھا اور اس کے ماتحت قاضیوں کی ایک کثیر تعداد ملک کے مختلف علاقوں میں عدالت کے فرائض انجام دیتی تھی۔ قاضی القضاۃ کا تقرر سلطان اپنی صوابدید کے مطابق کرتا تھا اور ماتحت قاضیوں کے تقرر اور تنزل کے کُلّی اختیارات قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں تھے۔ مملوک حکومت کے پہلے قاضی القضاۃ علاّمہ بدرالدین سنجاری تھے۔ ان کے بعد انتظامی مصلحتوں کے تحت ملک میں دو قاضی القضاۃ مقرر کیے گئے قاضی برہان الدین سنجاری اور قاضی تاج الدین بن بنت الاعز۔ اول الذکر قاہرہ اور ساحلی علاقوں کی عدالت کے فرائض انجام دیتے تھے اور مؤخر الذکر مصر اور سمندر کے محاذی علاقوں کے۔ ۶۶۰ھ میں سلطان بیبرس کسی معاملہ میں قاضی برہان الدین سے ناراض ہو گیا اور اُن کو معزول کرکے قاضی القضاۃ کے دونوں عہدوں کو پھر یکجا کر دیا۔ چنانچہ قاضی تاج الدین بن بنت الاعز تین سال تک ساری دولتِ مملوکیہ کے قاضی القضاۃ رہے۔ قاضی موصوف شافعی مسلک کے پیرو تھے اور اپنے مسلک میں بہت شدت کرتے تھے۔ چنانچہ وہ نہ صرف ماتحت قاضیوں کے تقرر میں تعصب سے کام لیتے تھے بلکہ سلطان کے ایسے احکام کو بھی، جن کو وہ اپنے مسلک کے خلاف سمجھتے تھے، نافذ نہیں کرتے تھے۔ سلطان علماء و فقہاء کا بیحد احترام کرتا تھا اس لیے اس نے قاضی تاج الدین سے چنداں تعرّض نہ کیا۔ لیکن ایک واقعہ نے اس کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور ۶۶۳ھ میں اس نے عدالتی نظام کا ڈھانچہ یکسر تبدیل کر دیا۔ واقعہ یہ ہُوا کہ قاضی تاج الدین کے حکم سے جمعہ کی نماز ہمیشہ شافعی مذہب کے مطابق ایک ہی جگہ جامع حاکمی میں ہُوا کرتی تھی۔ سلطان نے قاضی موصوف سے درخواست کی کہ نمازِ جمعہ "جامع ازہر"

میں پڑھنے کی اجازت دیں۔ انہوں نے اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر سلطان نے ایک حنفی قاضی صدر الدین بن سلیمان سے فتویٰ طلب کیا۔ انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا۔ چنانچہ اس کے بعد سلطان کے حکم سے نماز جمعہ جامع ازہر میں ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے ایک فرمان کے ذریعہ قاضی القضاۃ کے عہدے کی مرکزی حیثیت ختم کر دی اور ایک کے بجائے مذاہب اربعہ کے چار قاضی القضاۃ مقرر کر دیے۔ قاضی تاج الدین بن بنت الاعز شافعی مذہب کے قاضی صدر الدین بن سلیمان حنفی مذہب کے، قاضی شرف الدین ابو حفص عمر بن صالح مالکی مذہب کے اور قاضی شمس الدین محمد بن شیخ عماد الدین حنبلی مذہب کے قاضی القضاۃ بنائے گئے۔ ان اصلاحات کے بعد قاضی تاج الدین کی حیثیت صرف شافعی مذہب کے قاضی کی رہ گئی۔ تاہم ان کے علم و فضل کے پیش نظر سلطان نے "وراثت" "اوقاف" اور "اموالِ یتامیٰ" کے محکموں پر ان کی سیادت قائم رکھی۔

کسی امکانی اختلاف کا انسداد کرنے کے لیے سلطان نے ان چاروں بڑے قاضیوں کے فرائض، اختیارات، حدودِ کار اور علاقوں کی باقاعدہ نشان دہی کر دی۔ ان قضاۃ اربعہ کو اپنے ماتحت قاضی مقرر کرنے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔ ان کے علاوہ سلطان نے فوج کے لیے ایک قاضی مقرر کیا۔ وہ تمام فقہاء جو مملوک دستوں کے ساتھ ہوتے تھے اسی قاضی کے حکم سے مقرر کیے جاتے تھے اور اسی کے حکم سے ان کا تبادلہ یا تنزل عمل میں آتا تھا۔ قاضی فوج کے اختیارات گو صرف افواجِ سلطانی تک ہی محدود تھے لیکن اعزاز کے لحاظ سے اس کو دوسرے قضاۃ پر برتری حاصل تھی اور عدالتِ عظمیٰ میں وہ سلطان کے ساتھ بیٹھتا تھا۔

عدالتِ عظمیٰ یا عدالت گاہِ سلطانی

بیبرس سب سے پہلا مملوک سلطان ہے جس نے الملک العادل سلطان نورالدین محمود زنگی کی

عدالتِ عالیہ (دار العادل) کی طرز پر عدالتِ عظمیٰ یا عدالت گاہِ سلطانی قائم کی۔ اس کی حیثیت موجودہ دور کے سپریم کورٹ (Supreme Court) بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ کیونکہ اس عدالت کے چیف جسٹس (Chief Justice) کے فرائض سربراہ مملکت (سلطان) خود سر انجام دیتا تھا۔ عدالتِ عظمیٰ کی طرز پر ہر صوبہ میں بھی اعلیٰ عدالتیں قائم کی گئیں جو گورنروں کے ماتحت ہوتی تھیں تاہم گورنروں کے فیصلوں یا احکام کے خلاف عدالتِ عظمیٰ میں اپیل کی جا سکتی تھی۔

عدالتِ عظمیٰ کا دائرۂ کار مندرجہ ذیل امور پر محیط تھا:۔

۱۔ ایسے احکامات کو نافذ کرنا جن کا نفاذ محتسب اور قاضی نہ کر سکتے ہوں۔

۲۔ گورنروں اور قاضی القضاۃ کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت۔

۳۔ سول محکموں کے افسروں اور محرّروں کے خلاف مقدموں کی سماعت۔

۴۔ فوج اور پولیس کے افسروں کے خلاف مقدمات کی سماعت۔

۵۔ تنخواہوں میں تخفیف یا ان کی ادائیگی میں تاخیر کے خلاف مقدمات کی سماعت۔

۶۔ جہاد۔ عیدین۔ صیام رمضان۔ حج۔ جمعہ اور دوسری عبادات کا قیام اور تحفظ۔

سلطان ہر ہفتہ دو شنبہ اور پنج شنبہ کو عدالتِ عظمیٰ کا اجلاس کرتا تھا۔ اجلاس کے وقت قاضئ فوج، سلطان کے پہلو بہ پہلو بیٹھتا تھا اور ان دونوں کے دائیں بائیں قضاۃ اربعہ۔ صاحب دیوانِ انشا۔ افسر مالیات اور دوسرے اہم محکموں کے افسر موجود ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ عدالت میں مسلح پولیس اور فوج کے آدمیوں کی ایک مناسب تعداد۔ فریقینِ مقدمہ۔ گواہ اور محرّر بھی موجود رہتے تھے۔ مقدمات کی سماعت سے پہلے گواہوں کی ثقاہت کے بارے میں پوری چھان بین کر لی جاتی تھی۔ کسی دروغ گو اور مشکوک چال چلن کے آدمی کی شہادت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ مقدمات کے فیصلے قرآن و حدیث کی روشنی

میں کیے جاتے تھے اور عدالت میں موجود تمام قضاۃ سے رائے لی جاتی تھی اگر کسی مسئلہ میں ان کے مابین اختلاف پیدا ہو جاتا تو سلطان جس رائے کو قرین صواب سمجھتا اس کو قبول کر لیتا اور اسی کے مطابق اپنا فیصلہ دے دیتا۔ اس کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور اس کے خلاف کسی عدالت میں اپیل نہ ہو سکتی تھی۔ عام طور پر مقدمات کے فیصلے ایک ہی اجلاس میں سنا دیئے جاتے تھے۔ اگر کوئی بہت پیچیدہ مقدمہ ہوتا تو اس کا فیصلہ دو یا تین تاریخوں میں کر دیا جاتا۔ اس سے زیادہ کسی مقدمہ کو طول نہیں دیا جاتا تھا۔ تاہم مظلوموں کی فریاد رسی کے لیے سلطان نے اپنے آپ کو عدالت عظمٰی کا پابند نہیں رکھا تھا۔ بلکہ وہ ہر وقت اور ہر موقع پر مظلوموں کی شکایات سننے اور ان کو رفع کرنے کے لیے تیار رہتا تھا اور لوگوں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کرنے کے لیے اکثر بھیس بدل کر گشت کرتا رہتا تھا۔ اگر خود اس کی ذات کسی مقدمہ میں ماخوذ ہوتی تو وہ ایک عام آدمی کی طرح عدالت میں حاضر ہو جاتا اور عدالت کے فیصلہ کی لفظاً و معناً تعمیل کرتا۔

سلطان بیبرسؒ نے اپنا نظام عدالت اتنی مستحکم بنیادوں پر قائم کیا کہ مملوکوں کے پورے دورِ حکومت میں جاری رہا۔ بحری اور برجی مملوکوں کے دورِ حکومت کی مجموعی مدت ۲۷۰ برس ہے اور کسی نظام کا اتنی طویل مدت تک جاری رہنا بجائے خود اس کے ارفع و اعلیٰ ہونے پر دال ہے۔

صیغۂ احتساب

صیغۂ احتساب کے باقاعدہ قیام کا سراغ سب سے پہلے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہر حکومت احتساب کی ہمہ گیر

افادیت کے پیش نظر اس محکمہ کو خاص اہمیت دیتی رہی۔ اموی، عباسی، فاطمی اور ایوبی فرماں رواؤں کے دورِ حکومت میں یہ محکمہ پوری طرح سرگرم عمل رہا۔ مملوک برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے بھی اس محکمہ کو قائم رکھا۔ سلطان بیبرس اس محکمہ میں خاص دلچسپی لیتا تھا اور محتسبوں کی سرگرمیوں پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ اس کے عہد میں محتسبوں کے اختیارات اور فرائض یہ تھے۔

۱۔ منڈیوں اور بازاروں کی نگرانی کرنا اور نرخوں کو حدِ اعتدال کے اندر رکھنا۔

۲۔ کھانے پینے کی چیزوں کا معائنہ کرنا اور ان میں ملاوٹ کا سدِّ باب کرنا۔

۳۔ وزنوں، باٹوں اور پیمائش کے آلوں کی نگرانی کرنا۔

۴۔ جانوروں پر زیادہ بوجھ لادنے اور ان پر ظلم کرنے سے روکنا۔

۵۔ کھانے پینے کی اشیاء کو ڈھانپ کر رکھوانا۔

۶۔ مدارس میں استادوں کو طلبا پر بے جا سختی کرنے سے روکنا۔

۷۔ طبیبوں، دواسازوں، عطاروں، امراضِ چشم کا علاج کرنے والوں، فصد لینے والوں، سینگیاں لگانے والوں، داغنے والوں، جراحوں، ہڈی بٹھانے والوں، واعظوں، نجومیوں، کاتبوں اور دوسرے پیشہ وروں کی نگرانی کرنا۔ (محتسب طبیبوں، دواسازوں اور امراضِ چشم کے ماہروں کا امتحان لیتے تھے اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے تو ان کو اجازت نامے دیے جاتے تھے۔ اجازت نامے کے بغیر نہ وہ کسی کا علاج کر سکتے تھے اور نہ دوائیں بنا کر فروخت کر سکتے تھے)

۸۔ لوگوں کو خلافِ تہذیب و خلافِ قانون حرکات و افعال سے روکنا (یہاں تک کہ پاجاموں اور تہہ بندوں تک کو آدابِ عامہ اور تہذیب و معاشرت کے مطابق باندھنے پر لوگوں کو مجبور کرنا۔

۹- امن عامہ میں خلل ڈالنے والوں سے باز پرس کرنا۔

۱۰- احکام شرعی کا تحفظ اور ان کی پابندی کرانا (یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اہتمام کرنا۔)

۱۱- نادہندوں سے قرض خواہوں کو قرض واپس کرانا اور امانت میں خیانت کرنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچانا۔

۱۲- لوگوں کی عزت و ناموس کی حفاظت کرنا (اس میں اوباشوں اور بدقماشوں کا قلع قمع کرنا بھی شامل تھا۔

سلطان یا متعلقہ صوبائی گورنر کی طرف سے ہر ایک شہر اور ہر ایک قصبہ میں ایک محتسب مع اپنے ماتحت عملہ کے مقرر تھا۔ محتسبوں کے اختیارات بڑے وسیع تھے اور وہ شہری امن و امان کی حفاظت اور عامۃ الناس کو بددیانت اور دھوکے باز پیشہ وروں اور تاجروں سے بچانے کے لیے فوری اقدامات کرتے تھے۔ عام حالات میں ایک محتسب تہذیب اور قانون ملکی کے خلاف حرکات و افعال کرنے والوں کو گرفتار کر کے فوراً سزا بھی دے سکتا تھا۔ البتہ دینی معاملات سے تعلق رکھنے والے تمام مقدمات اس کو علاقہ کے قاضی یا قاضی القضاۃ کی عدالت میں پیش کرنے پڑتے تھے۔ اسی طرح سیاسی مجرموں کو سزا دینا اس کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ پولیس کو حکم تھا کہ وہ محتسبوں اور ان کے عملہ سے پورا تعاون کرے۔ بعض مخصوص حالات میں تو پولیس کے لیے محتسب کے احکام کا نفاذ لازمی قرار دیا گیا تھا۔ سلطان کے نزدیک احتساب (حسبہ) حکومت کے دینی فرائض میں داخل تھا۔ محتسبوں کے افعال و کردار کی نگرانی سلطان خود یا اس کے صوبائی گورنر کرتے تھے۔ اگر کوئی محتسب اپنے فرائض سے غفلت یا کسی دوسری بدعنوانی کا مرتکب پایا جاتا تو اس کو عبرت ناک سزا دی جاتی تھی۔ لیکن ایسا موقع شاذ ہی پیدا ہوتا تھا کیونکہ محتسب

کے انتخاب میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جاتا تھا اور وہی لوگ اس عہدہ کے اہل سمجھے جاتے تھے جن کی دیانت اور قابلیت کسی شک و شبہ سے بالا ہو۔

مالیات

وسائلِ آمدنی

سلطان بیبرس کے عہد میں حکومت کی آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع یہ تھے:

۱۔ پیداوار پر لگان

زمین کی پیداوار پر مختلف لگان تھا۔ اس کی شرح میں پیداوار کی زیادتی اور قلت کی بنا پر کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ سمندر کے محاذی علاقہ کا لگان، پیداوار کی صورت میں لیا جاتا تھا۔ یہ پیداوار گندم۔ جو۔ لوبیا۔ مسور۔ تل اور پیاز وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ ساحلی علاقوں کا لگان نقد روپیہ کی صورت میں لیا جاتا تھا۔ لگان کی شرح مقرر کرتے وقت زمین کی حالت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ غیر معمولی زرخیز زمینوں پر لگان کی شرح زیادہ تھی اور دوسری زمینوں پر کم۔

۲۔ زکوٰۃ

حکومت نے زکوٰۃ جمع کرنے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ زکوٰۃ نقد اور جنس کے علاوہ مال و اسباب کی صورت میں بھی وصول کی جاتی تھی اسکندریہ کی بندرگاہ سے جو سامان باہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا اس سے

زکوٰۃ وصول کرنے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔

۳۔ قاہرہ کے دارالضرب (ٹکسال) کی آمدنی

۴۔ جزیہ

غیر مسلموں سے ان کی جان و مال کی حفاظت۔ فوجی خدمت سے استثناء اور دوسری سہولتوں کے عوض ایک خاص شرح کے مطابق جزیہ لیا جاتا تھا اس کی مقدار بالعموم دس اور پچیس درہم کے درمیان ہوتی تھی۔

۵۔ درآمدی محصول یا چنگی

بیرونی ملکوں سے جو سامان اسکندریہ یا دمیاط کی بندرگاہوں کے ذریعہ درآمد ہوتا تھا۔ اس پر دس سے پینتیس ۳۵ فی صد تک درآمدی محصول وصول کیا جاتا تھا۔

۶۔ لاوارث مال و اسباب اور جائداد وغیرہ

۷۔ معدنیات

ان میں نمک، نطرون اور زمرد قابلِ ذکر ہیں۔

۸۔ مفروروں اور باغیوں کی جائداد

۹۔ مالِ غنیمت

ترقیٔ زراعت

سلطان نے زراعت کی ترقی میں خاص دلچسپی لی اور آبپاشی کے نہایت عمدہ انتظامات کیے۔ اس نے دریائے نیل سے کئی نہریں نکلوائیں۔ متعدد مقامات پر بند بنوائے اور تالاب بنوائے۔ اس طرح قابلِ زراعت زمین کے رقبے میں خاصہ اضافہ ہو گیا اور اسی نسبت سے لگان کی آمدنی پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔

ناجائز محاصل کی موقوفی

سلطان نے حکومت کی آمدنی میں اضافہ کے لیے اگرچہ کسی اقدام سے گریز نہیں کیا لیکن یہ اقدامات صرف جائز محاصل کی وصولی تک محدود تھے۔ ایسے تمام محاصل جن کو علماء و فقہاء نے شرعاً ناجائز ٹھہرایا تھا، سلطان نے یکسر موقوف کر دیے۔ اسی طرح شراب خانوں، جوئے خانوں، قحبہ خانوں اور نشہ آور اشیاء کے کاروبار سے آمدنی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ سلطان نے ان کی بساط ہی لپیٹ کر رکھ دی اور اس معاملے میں بڑی سختی سے کام لیا۔ ناجائز محاصل یا ذرائع آمدنی تو ایک طرف رہے سلطان نے بعض جائز محاصل میں بھی کمی کر دی ان میں مالِ تجارت کا درآمدی محصول خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔

حکومت کی آمدنی میں اضافہ

سلطان کے حسنِ انتظام اور زراعت و تجارت کی ترقی سے ملک کے خراج میں حیرت انگیز اضافہ ہوا اور اس کی مقدار ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تک پہنچ گئی اس سے پہلے فاطمیوں اور ایوبیوں کے دورِ حکومت میں یہ مقدار پچاس لاکھ دینار سے کبھی نہیں بڑھی تھی۔

ڈاک کا نظام

بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ اقتدار میں ڈاک کا نظام بہت اعلیٰ پیمانے پر

قائم تھا۔ فاطمیوں اور ایوبیوں کے دورِ حکومت میں ڈاک کا محکمہ قائم تو رہا لیکن اس نے چنداں ترقی نہ کی۔ مملوکوں میں سب سے پہلے سلطان بیبرس نے ڈاک کے نظام پر خاص توجہ دی اور مختلف اقدامات کے ذریعے بہت تھوڑی مدت میں اس کو انتہائی اونچے معیار پر پہنچا دیا۔ مشرقی اور مغربی تمام مؤرخین نے اس کے نظامِ ڈاک کی بے حد تعریف کی ہے۔

محکمہ ڈاک کا مرکز

مملوکوں کے عہد میں مرکزیت کو ہمیشہ خاص اہمیت حاصل رہی۔ چنانچہ بیبرس نے نظامِ ڈاک کی ترقی و اصلاح کے لیے سب سے پہلے اس کا مرکز قائم کیا۔ یہ مرکز قلعہ جبل میں تھا جو قاہرہ کے مشرق میں جبل مقطم کے پاس واقع تھا۔ یہ قلعہ ۵۷۲ھ میں سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے تعمیر کرایا تھا۔ اس قلعہ سے چار راستے مختلف سمتوں کو نکلتے تھے ـــ ایک راستہ اسکندریہ تک، دوسرا قوص تک تیسرا دمیاط اور غزہ تک اور چوتھا عیذاب تک جاتا تھا (یہ بحر احمر کی ایک اہم بندرگاہ تھی جہاں ہندوستان، یمن اور حبشہ سے جہاز آتے تھے۔ مصر سے عازمین حج بھی یہاں آتے تھے اور پھر وہاں سے سمندر کے راستے جدّہ پہنچتے تھے) سرکاری ڈاک قلعہ جبل ہی سے مختلف مقامات کو روانہ کی جاتی تھی اسی طرح گورنروں اور وقائع نویسوں کے خطوط بھی اسی جگہ پہنچتے تھے۔ بیبرس کے عہد میں مصر میں ہر تین یا چار دن کے بعد (یا ہفتے میں دو بار) باہر سے ڈاک آتی تھی۔

ڈاک کی چوکیاں یا ڈاک خانے

سلطان نے تمام ممالک محروسہ میں جا بجا ڈاک کی چوکیاں قائم کردی تھیں۔

یہ چوکیاں ڈاک کے چھوٹے مرکزوں یا ڈاک خانوں کا کام بھی دیتی تھیں۔ ڈاک کی چوکی یا ڈاک خانہ کھولنے میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ یہ کسی آباد گاؤں کے قریب ہو اور وہاں پانی با فراط ملتا ہو۔ ڈاک کے ہر مرکز میں انسانوں اور جانوروں کے لیے خورد و نوش اور دوسری ضروریات کا مناسب ذخیرہ رہتا تھا اور اس کی حفاظت کا بھی مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ ڈاک کے ملازمین ان مراکز میں نہایت آسائش کے ساتھ رات گزار سکتے تھے۔ ہر ڈاک خانہ میں تندرست اور تیز رفتار گھوڑوں کی ایک مناسب تعداد بھی رہتی تھی۔ یہ گھوڑے ڈاک کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کے لیے کام میں لائے جاتے تھے اور ان کے لیے سلطانی نشان ضروری ہوتا تھا ڈاک کے مرکزوں سے ڈاک تقسیم بھی ہوتی تھی اور دوسری جگہوں کو بھیجنے کے لیے لی بھی جاتی تھی۔

محکمہ ڈاک کا افسر اعلیٰ

محکمہ ڈاک کا نگران، دیوان انشاء کا افسر ہوتا تھا۔ وہی ڈاک کے بڑے اور چھوٹے مرکزوں کا انتظام کرتا تھا اور وہی ڈاک کے ملازمین کی بھرتی کا ذمہ دار تھا

ڈاک کی تختیاں

محکمہ ڈاک کا افسر اعلیٰ اپنے دفتر میں چاندی کی بہت سی تختیاں محفوظ رکھتا تھا۔ ان تختیوں کے ایک طرف "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ۝ ضرب بالقاهرة المحروسة" لکھا ہوتا تھا اور دوسری طرف "عز المولانا السلطان ... سلطان الاسلام والمسلمین" کندہ ہوتا تھا۔ جب کوئی چٹھی رسان ڈاک لے

کرروانہ ہوتا تھا تو ایک تختی اس کو دے دی جاتی تھی وہ یہ تختی اپنے گلے میں لٹکا لیتا تھا۔ جب سرکاری کام سے فارغ ہو جاتا تو اسے اتار کر دفتر میں جمع کرا دیتا تھا۔ ڈاک کے کسی ملازم کو ضرر پہنچانا یا اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنا سخت جرم تھا۔ ان کی حفاظت کی ذمہ داری علاقہ کے ناظم کے سپرد تھی۔

ہوائی ڈاک

آج سے سات سو برس پہلے کے ماحول میں "ہوائی ڈاک" کی اصطلاح کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ سلطان بیبرس کے عہد میں "بری ڈاک" کی طرح "ہوائی ڈاک" کا نظام بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر قائم تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُس وقت ہوائی ڈاک ہوائی جہازوں کے بجائے نامہ بر کبوتروں کے ذریعہ بھیجی جاتی تھی۔ بیبرس سے پہلے مجاہد اعظم سلطان نورالدین محمود زنگیؒ والیٔ شام و مصر (۵۴۱ھ / ۱۱۴۶ء تا ۵۶۹ھ / ۱۱۷۳ء) ناصر لدین اللہ عباسی خلیفۂ بغداد (۵۷۵ھ / ۱۱۸۰ء تا ۶۲۲ھ / ۱۲۲۵ء) اور مصر کے فاطمی خلفاء، ڈاک بھیجنے کے لیے نامہ بر کبوتروں سے وسیع پیمانے پر کام لے چکے تھے۔ بیبرس سریر آرائے حکومت ہوا تو اس نے نامہ بر کبوتروں کے محکمہ کو از سرِ نو قائم کیا اور اس کی توسیع و ترقی کے لیے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اس نے نامہ بر کبوتروں کا مرکز بری ڈاک کے مرکزِ اعلیٰ کے ساتھ ہی قلعہ جبل میں قائم کیا جہاں ان کے رہنے کے لیے خاص قسم کے برج بنوائے اور اس کے ساتھ ہی ان کو سدھانے اور ان کی غور و پرداخت کے لیے خاص انتظامات کیے۔ ان کبوتروں سے بالعموم سرکاری ڈاک کی ترسیل کا کام لیا جاتا تھا اور ان کے لیے مناسب فاصلوں پر خاص منزلیں یا چوکیاں بنائی گئی تھیں۔ ان چوکیوں کا درمیانی فاصلہ بری ڈاک کی چوکیوں کے درمیانی فاصلے سے زیادہ ہوتا تھا۔ کبوتروں کی ڈاک

کی ہر چوکی پر ایک بُرج بنا ہوتا تھا جہاں چند نامہ بر کبوتر ہر وقت موجود رہتے تھے ان کی نگرانی کے لیے ہر چوکی پر خاص عملہ مقرر تھا۔ ہر کبوتر کے اُڑنے کے لیے ایک چوکی مخصوص کر دی جاتی تھی۔ جب وہ اس چوکی کے بُرج پر اترتا تو وہاں کا نگران اعلیٰ اس کے پروں سے خط کھول کر دوسرے کبوتر کے بازوؤں یا پروں میں باندھ دیتا اور اس کو اگلی منزل کے لیے روانہ کر دیتا۔ یہ سلسلہ آخری منزل تک اسی طرح جاری رہتا۔

بیبرس کے عہد میں نامہ بر کبوتروں کی مشہور منزلیں یہ تھیں۔

قلعہ جبل (قاہرہ) سے اسکندریہ

" " دمیاط

" " بلبیس

بلبیس سے صالحیہ

صالحیہ " غزہ

غزہ " بیت المقدس

" " نابلس

" " لُد

لُد " صفد

صفد " بیسان

بیسان " دمشق

دمشق " بعلبک۔ قریتین اور قارا

قارا " حمص

حمص " حماۃ

حماۃ سے معرہ

معرہ " حلب

حلب " بھسنی

قریتین " تدمر

تدمر " قباقب

قباقب " رحبہ

عام طور پر ایک ہی مضمون کے دو خط لکھے جاتے تھے اور ان کو دو کبوتروں کے ذریعہ روانہ کیا جاتا تھا۔ دوسرا کبوتر پہلے کبوتر کے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد چھوڑا جاتا تھا۔ یہ ایک احتیاطی تدبیر تھی کہ اگر پہلے کبوتر کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو دوسرا کبوتر پیغام پہنچا دے۔ خط کو کبوتر کے بازوؤں یا پروں کے نیچے ایسے طریقے سے باندھا جاتا تھا کہ اگر بارش آجائے تو بھیگنے نہ پائے۔

نامہ بر کبوتر کو روانہ کرنے سے پہلے اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ بھوکا پیاسا نہ ہو اور اُس وقت بارش برسنے کا احتمال بھی نہ ہو۔ جو کبوتر خاص سلطان کے نام خط لاتا تھا اس کی چونچ پر سُرخ رنگ کر دیا جاتا یا کوئی اور خاص نشان لگا دیا جاتا تھا۔ جب یہ کبوتر قلعہ جبل میں پہنچتا تو سلطان کو فوراً مطلع کیا جاتا تھا اور اس بات کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا کہ وہ کھانا کھا رہا ہے یا بستر خواب پر ہے۔ سلطان اطلاع ملتے ہی قلعۂ جبل میں پہنچ جاتا تھا اور خود اپنے ہاتھ سے کاغذ کھولتا تھا اور اسے پڑھ کر مناسب احکام صادر کر دیتا تھا۔ اگر سلطان سفر میں ہوتا اور اس کے نام کا کوئی خط ہوتا تو نامہ بر کبوتر سلطان کی قیامگاہ سے قریب ترین (ہوائی ڈاک کی) چوکی پر اترتا اور سُلطان خود وہاں جا کر خط وصول کرتا۔ کسی دوسرے کو یہ خط کھولنے اور پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

نامہ بر کبوتروں کے ذریعہ بھیجے جانے والے خطوط ایک خاص قسم کے کاغذ پر لکھے جاتے تھے جس کو "وَرَقُ الطَّیر" کہا جاتا تھا۔ ان خطوط کے لکھنے میں انتہائی اختصار سے کام لیا جاتا تھا۔ نہ ان پر حاشیہ چھوڑا جاتا تھا اور نہ ان کے آغاز میں بسم اللہ اور دوسرے القاب و آداب لکھے جاتے تھے البتہ ان کے آخر میں تاریخ اور وقت ضرور لکھا جاتا تھا۔ خط کی عبارت حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوتی تھی اور یہ "حَسْبُنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل" کے الفاظ کے ساتھ ختم ہوتی تھی ـــــ مختصر یہ کہ برّی ڈاک کے نظام کی طرح عہدِ بیبرس میں ہوائی ڈاک کا نظام بھی اتنا مربوط اور مکمل تھا کہ سلطنت میں خواہ کیسے ہی دور دراز مقام پر کوئی حادثہ یا غیر معمولی واقعہ پیش آتا تو دو تین دن کے اندر اس کی اطلاع لازماً سلطان کو پہنچ جاتی تھی۔ ڈاک کا یہ اعلیٰ نظام نہ صرف داخلی نظم و نسق کو بہتر بنانے بلکہ بیرونی دشمنوں سے بھی مؤثر طور پر نبٹنے میں سلطان کا زبردست ممدّ و معاون ثابت ہوا۔

فوج

سلطان بیبرس نے "فتنۂ تاتار" اور صلیبی جنگوں کا زمانہ پایا۔ چنانچہ تاتاری غارت گروں اور صلیبی جنونیوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس نے ایک زبردست فوج تیار کی۔ مختلف مؤرخین نے اس کے فوجی نظام کے بارے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

برّی فوج

برّی فوج کے دو حصے تھے "ملوکین سلطانی" اور "جنودِ حلقہ" ـــــ

اوّل الذکر خالص مملوکوں پر مشتمل فوج تھی۔ یہ مملوک سلطان کے ہم وطن تھے اور ان کو سلطانی تقرّب حاصل تھا۔ سلطان نے چھوٹی عمر کے مملوکوں کو نہایت کثرت سے خریدا تھا اور پھر ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی تھی سب سے پہلے ان کو نوشت و خواند قرآن اور شعائر اسلام کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے متعدد "بچھیرا" (مملوک لڑکوں کے) دستے بنا دیے گئے تھے اور ہر ایک دستے کے لیے ایک فقیہ مقرر کر دیا گیا تھا مملوک لڑکوں کے سنِ بلوغ تک یہ تعلیم جاری رہتی۔ اس کے بعد اُن کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ جب وہ تمام فنونِ جنگ میں طاق ہو جاتے تھے تو ان کو سلطانی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ امراءِ دربار انہی مملوکوں سے منتخب کیے جاتے تھے۔ اس خالص مملوک فوج کو بھی ان تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

۱۔ باقاعدہ فوج۔ اس کے تمام اخراجات حکومت برداشت کرتی تھی۔

۲۔ سلطانی مملوک۔ ان کے اخراجات سلطان خود برداشت کرتا تھا یہ بالعموم سلطان کی ذاتی حفاظت کا فرض انجام دیتے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر ان سے عام فوجی خدمت بھی لی جا سکتی تھی۔

۳۔ امراء کے مملوک۔ سلطان نے اپنے خاص امراء کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ مملوکوں کی ایک خاص تعداد اپنے پاس رکھیں۔ ان مملوکوں کے اخراجات امراء برداشت کرتے تھے۔ اور مملوک ان امراء کی ذاتی حفاظت کے علاوہ جنگی معرکوں میں دوسری فوج کے دوش بدوش لڑتے تھے۔

مملوک فوج کا ہیڈ کوارٹر (صدر مقام) جزیرہ روضہ کے سلطانی قلعہ میں تھا اس قلعہ میں ہر قسم کا جنگی ساز و سامان اور اشیائے خورد و نوش کثیر مقدار میں موجود تھیں اور اس کے برجوں میں مملوک امراء قیام پذیر رہتے۔

جنودِ حلقہ

یہ سلطان کی عام فوج تھی جو مختلف علاقوں کے جنگ جوؤں پہ مشتمل تھی ان میں عرب (مصری۔ عراقی۔ یمنی۔ شامی۔ فلسطینی) سوڈانی۔ بربری اور کرد خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔

اس فوج کو بھی پانچ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔

۱۔ پیدل دستے

۲۔ سوار دستے

۳۔ رضا کار دستے

۴۔ محفوظ دستے

۵۔ مشینی دستے

میدانِ جنگ میں سلطان باقاعدہ فوج اور رضاکار فوج کے دستوں کی ایک مناسب تعداد بیک وقت حرکت میں لاتا تھا۔ باقی دستے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے تھے۔ محفوظ دستے صرف ضرورت پڑنے پر جنگ میں شامل ہوتے تھے۔

مشینی دستوں کے ذمے یہ کام تھے:

۱۔ فوج کے گزرنے کے لیے راستہ تیار کرنا۔

۲۔ ندی نالوں پہ پل باندھنا۔

۳۔ کسی شہر کے محاصرے میں منجنیقیں، دبّابے اور دوسرے قلعہ شکن آلات استعمال کرنا۔

سامان اِدھر سے اُدھر لے جانے کے لیے اور فوج کے لیے رسد اور

دوسری ضروریات کی بہم رسانی کا معقول انتظام تھا۔ اس مقصد کے لیے اونٹ خچر اور گھوڑے استعمال کیے جاتے تھے۔

بیمار اور زخمی سپاہیوں کے علاج کے لیے طبیبوں اور جراحوں کی ایک معقول تعداد بھی فوج کے ساتھ رہتی تھی ان کو روئی۔ پٹیاں۔ دوائیں۔ جراحی کے آلات اور دوسری ضروری اشیاء حسب طلب فراہم کی جاتی تھیں۔

فوج اور امراء کے مخصوص مراتب اور امتیازات تھے۔ جنود حلقہ میں ہر چالیس سپاہیوں پر ایک افسر ہوتا تھا۔ میدان جنگ میں ان سپاہیوں کی صف بندی اور نگرانی اسی افسر کے ذمہ تھی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو معمولی سزا تو دے سکتا تھا لیکن سلطان یا نائب السلطان کی اجازت کے بغیر اپنے کسی سپاہی کو برخاست نہیں کر سکتا تھا۔

مؤرخین نے سلطان کی باقاعدہ فوج کی تعداد کی تصریح نہیں کی لیکن مختلف کوائف سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر سلطان دو لاکھ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فوج آناً فاناً میدان جنگ میں لا سکتا تھا۔

فوج کا لباس

سلطان کی فوج کا لباس (وردی یا یونی فارم) بالعموم یہ تھا سر پر زرد کلاہ بغیر عمامہ کے اور جسم پر سوتی قبا جس کے جیب و گریبان تنگ ہوتے تھے اور جس میں بٹنوں کی جگہ روئی کی ٹھوس گھنڈیاں لگی ہوتی تھیں۔ فوج کے مختلف طبقے مختلف رنگ کی قبائیں پہنتے تھے۔ ان کا رنگ تمام طور پر سفید نیلا یا سرخ ہوتا تھا۔ فوج کے کئی دستوں کو لوہے کی مضبوط زرہیں بھی مہیا کی جاتی تھیں جو وہ میدان جنگ میں پہنتے تھے۔

اسلحہ

سلطان بیبرس کی افواج کے عمومی ہتھیار تلوار، نیزہ اور تیر و کمان تھے۔ یہ ہتھیار زیادہ تر دمشق اور قاہرہ میں بنائے جاتے تھے اور ان کی ساخت نہایت عمدہ اور مضبوط ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ سلطانی افواج منجنیقوں اور دبابوں کے استعمال میں بھی بڑی مہارت رکھتی تھیں۔ کسی شہر یا قلعہ کے محاصرے میں اگر منجنیقوں کی سنگ باری دیواریں توڑنے میں ناکام رہتی تو پھر دبابے استعمال کیے جاتے۔ دبابہ لکڑی کا ایک برج ہوتا تھا جس میں اوپر تلے کئی درجے ہوتے تھے اور نیچے پہیے لگے ہوتے تھے اس میں تیر اندازوں اور سنگ اندازوں کے علاوہ کچھ ایسے فوجیوں کو بھی بٹھا دیا جاتا تھا جو خاص آلات کے ذریعہ دیواروں میں شگاف ڈالنے میں مہارت رکھتے تھے۔ پھر اس کو ریلتے ہوئے آگے بڑھاتے تھے اس طرح قلعہ کی دیواروں کے نیچے پہنچ جاتے تھے اور ان کو آلات کے ذریعے توڑ دیتے تھے۔

جاگیریں

سلطان بیبرس کے عہد میں فوجیوں اور امراء کو جاگیریں عطا کی جاتی تھیں فوج کے مختلف عہدے دار ایک ایک علاقے پر قابض ہوتے۔ ان کا ایک منصب مقرر ہوتا اور فرائض میں یہ ہوتا کہ حسب طلب ایک مقررہ تعداد میں فوج لے کر دربارِ حکومت میں حاضر ہوں۔ چنانچہ وہی عہدے دار زمیندار کی حیثیت رکھتے اور وہاں کے باشندے عام کاشت کار ہوتے۔ جاگیریں عام طور پر میعادی ہوتی تھیں۔ جب جاگیر کے پٹے کی مدت ختم ہو جاتی تھی یا جاگیردار مر جاتا تھا تو

یہ جاگیر حکومت کی ہو جاتی تھی البتہ نمایاں خدمات انجام دینے والے معتمد اور وفادار جاگیرداروں کی جاگیریں موروثی بھی کر دی جاتی تھیں۔ فوج اور امراء کے لیے جاگیروں کے علاوہ مالِ غنیمت سے بھی حصے مقرر تھے۔ سلطان کے عہد میں صلیبیوں اور دوسرے دشمنوں کے خلاف اکثر معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں ان لڑائیوں میں بے شمار مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا۔ فوج کا ہر سپاہی حصہ رسدی کے مطابق ان کا حق دار تھا۔ چنانچہ مالِ غنیمت کی کثرت کی وجہ سے سلطان کی فوج کے امراء اور سپاہی عام طور پر خوش حال تھے۔ علاوہ ازیں حکومت کی طرف سے فوجیوں کو خورد و نوش وغیرہ کے الاؤنس کی صورت میں مقرر رقمیں بھی دی جاتی تھیں۔ بعض دفعہ یہ رقوم ایسے امراء کی اولاد کو بھی دی جاتی تھیں جن کے پاس جاگیریں نہیں ہوتی تھیں۔

جاگیرداری کا یہ نظام سلطان بیبرس نے ایوبیوں سے ورثے میں پایا تھا دورِ حاضر میں یہ نظام کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے لیکن اس زمانہ کے حالات کے پیشِ نظر یہی نظام ملک کے بہترین مفاد میں سمجھا گیا تھا کیونکہ یہ نہ صرف زراعت اور پیداوار میں غیر معمولی ترقی کا ضامن تھا بلکہ اس کی بدولت ایک زبردست فوج بھی نہایت قلیل مدت میں بغیر کسی دقت کے فراہم ہو سکتی تھی۔

بحری فوج

بیبرس سے پہلے مصر کی فاطمی حکومت کا بحری بیڑا خاصا طاقتور تھا ان کے بعد ایوبی آئے تو انہوں نے بھی اپنے بحری بیڑے کی قوت بڑھانے کی طرف خاص توجہ کی چنانچہ ان کا زبردست بحری بیڑا مدت تک صلیبیوں کے بحری حملوں کا منہ توڑ جواب دیتا رہا لیکن جوں جوں ایوبیوں کا آفتاب اقتدار ڈھلتا گیا ان کے بحری

بیڑے کی قوت بھی گھٹتی گئی۔ یہاں تک کہ لوگ بحری فوج میں بھرتی ہونے سے گریز کرنے لگے۔ مملوکوں کی حکومت کا آغاز ہوا تو انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو پھر ایک فعال قوت بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ بیبرس نے برسرِ اقتدار آ کر اس کام میں ذاتی دلچسپی لی۔ اس نے اسکندریہ اور دمیاط میں جہاز سازی کے دو نئے کارخانے قائم کیے اور ان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں مہیا کیں۔ جزیرہ روضہ میں پہلے ہی جہاز سازی کا ایک عظیم الشان کارخانہ قائم تھا۔ سلطان نے اس کو مزید وسعت اور ترقی دی۔ ان کارخانوں کو "دارالصناعۃ" کہا جاتا تھا اور سلطان وقتاً فوقتاً اُن کا معائنہ کرتا رہتا تھا۔ جہاز بنانے کے لیے ایک خاص قسم کی لکڑی استعمال کی جاتی تھی۔ سلطان نے دوسرے مقاصد کے لیے اس لکڑی کا استعمال ممنوع قرار دیا تھا۔ یہ لکڑی زیادہ تر لبنان کے جنگلات سے حاصل کی جاتی تھی حکومت ان جنگلات کی کڑی نگرانی کرتی تھی۔

سلطان بیبرس کا جنگی بیڑا صنعت کے اعتبار سے اُس دور کے ترقی یافتہ جہازوں اور کشتیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے جہاز مضبوط چوبی تختوں کے ہوتے جو لوہے کی میخوں سے جڑے جاتے اور ڈانڈوں اور بادبانوں کے ذریعہ چلائے جاتے تھے۔ سامانِ رسد، اسلحہ اور گھوڑے لے جانے کے لیے کشتیاں یا چھوٹے جہاز استعمال کیے جاتے تھے۔

۶۶۹ھ میں سلطان نے ایک جنگی بیڑا قبرص روانہ کیا لیکن بدقسمتی سے یہ بیڑا اس جزیرے کے قریب پہنچ کر ایک خوفناک سمندری طوفان میں پھنس کر تباہ ہو گیا۔ سلطان کو اس بیڑے کی تباہی سے سخت صدمہ پہنچا لیکن وہ بڑا باہمت انسان تھا۔ اس نے نئے ولولے اور عزم کے ساتھ نیا بیڑا تیار کرنا شروع کر دیا اور اس وقت تک دم نہ لیا۔ جب تک کہ برباد شدہ بیڑے کی تلافی نہ ہو گئی

نیا بیڑا تیار ہوا تو سلطان کی بحری قوت پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے عہد میں کسی دشمن کو سمندر کے راستے مصر یا شام پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی۔

محکمہ پولیس

مملوکوں سے پہلے پولیس کا محکمہ "دیوان الشرطہ" کہلاتا تھا اور اس محکمہ کے افسر اعلیٰ کو "صاحب الشرطہ" کہتے تھے۔ مملوکوں کے عہد میں اس کو "والی" کا لقب دیا گیا البتہ کوتوال شہر کو "صاحب عسس" کہا جاتا تھا۔ بیبرس کے عہد میں قاہرہ کے علاوہ ہر صوبائی دارالحکومت میں بھی پولیس کا ایک بڑا دفتر قائم تھا۔ پولیس کے بنیادی فرائض میں امن وامان کا قیام، مجرموں اور قاتلوں کی گرفتاری اور ان پر حد جاری کرانا، محتسبوں کو ان کے فرائض مؤثر طور پر انجام دینے میں مدد دینا، قضاۃ کے فیصلوں پر بشرط ضرورت قوت سے عمل کرانا اور اسی قسم کے دوسرے امور شامل تھے۔ ان کے علاوہ پولیس کے سپرد یہ کام بھی تھے۔

۱۔ عیدین۔ جمعہ۔ جنازوں۔ سلطانی جلوس اور دوسرے اجتماعات کے موقع پر نظم وضبط قائم رکھنا۔

۲۔ کفن چوروں سے قبروں کی حفاظت کرنا اور ان کو بے حرمتی سے بچانا۔

قاہرہ میں آگ بجھانے کا عملہ (فائر بریگیڈ) بھی کوتوال شہر کے ماتحت تھا۔ اس عملے کا مرکزی دفتر "سوق جالون کبیر" میں تھا۔ اس دفتر میں ساری رات روشنی رہتی تھی۔ آگ بجھانے کا عملہ عشاء کی نماز کے بعد وہاں آجاتا تھا اور صبح تک وہیں رہتا تھا۔ اگر کہیں آگ لگ جاتی تو لوگ اس دفتر میں اطلاع دیتے

اور یہ عملہ فوراً جائے حادثہ پہ پہنچ کر آگ بجھانے میں مشغول ہو جاتا تھا۔ اس عملہ کی آمد و رفت کے لیے خاص انتظام کیا گیا تھا تاکہ وہ کم سے کم وقت میں موقع پہ پہنچ سکے۔ اس میں سقے۔ لوہار اور بڑھئی وغیرہ کافی تعداد میں بھرتی کیے گئے تھے۔ ۶۶۳ھ میں قاہرہ میں متعدد مقامات پر آگ لگی۔ اس وقت آگ بجھانے والے عملہ نے بڑی مفید خدمات انجام دیں اور آگ پہ قابو پا لیا ورنہ کچھ موقعوں پہ سارے شہر میں اس کے پھیل جانے کا خدشہ تھا۔

صنعت و حرفت اور تجارت

صلاح الدینؒ سے بیبرس تک

الملک الظاہر بیبرس کا بیشتر زمانۂ حکومت جنگ و جہاد میں گزرا لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے عہد میں زراعت کی طرح صنعت و حرفت اور تجارت کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ دراصل اس میدان میں ترقی کا آغاز سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے زمانے ہی سے ہو گیا تھا۔ مصر، شام، لبنان اور فلسطین کی زمینیں سونا اگلتی تھیں اور وہاں ایسی جنسوں کی بہتات تھی جن کو اہلِ یورپ نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی طرح ان ممالک کے باشندوں کو یورپ کی کئی چیزوں کی احتیاج تھی۔ جب صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں مشرقی اور مغربی اقوام میں ربط و ضبط پیدا ہوا تو انہوں نے ایک دوسرے سے مختلف جنسوں کا مبادلہ کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ جب ان کے حکمرانوں نے اس رجحان کی حوصلہ افزائی کی تو مشرق وسطیٰ اور قسطنطنیہ کے مابین زور شور سے تجارت شروع

ہو گئی۔ بیزنطینی تاجروں کو مصر اور شام کے اسلامی شہروں میں بسنے کی اجازت مل گئی اور مصری و شامی تاجروں کو قسطنطنیہ میں سکونت پذیر ہونے کا پروانہ مل گیا۔ فلپ کے حتی "تاریخ شام" میں لکھتا ہے :۔

"صلاح الدین کے زمانے سے شامی تاجروں نے قسطنطنیہ میں اقامت اختیار کر لی تھی اور صلاح الدین کی درخواست پر شہنشاہِ قسطنطنیہ نے اُن کے لیے ایک مسجد بنوائی تھی اسی طرح مصری تاجر بھی وہاں جا پہنچے تھے۔ بیزنطینی تاجروں کو شام و مصر میں ایسی ہی مراعات حاصل تھیں۔ اور کسی اجنبی تاجر کو بیزنطینی دارالحکومت میں مستقل اقامت کی اجازت نہ تھی۔"

صلاح الدین کے بعد جب الملک العادل ایوبیؒ اور پھر ملک الظاہر بیبرس نے اہلِ وینس اور دوسرے یورپی تاجروں کو خاص مراعات دیں تو مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے درمیان تجارت اوجِ کمال پر پہنچ گئی۔ قاہرہ۔ دمشق اور حلب وغیرہ میں اہلِ وینس و جینوا اور دوسرے یورپی تاجروں نے اپنے محلّے بنا کر مستقل اقامت اختیار کر لی۔ اسی طرح مصری اور شامی تاجر یورپی ممالک میں جا کر مقیم ہو گئے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ شرقِ اوسط کے لوگوں کی تجارت صرف اہلِ یورپ تک محدود تھی۔ فی الحقیقت ایران۔ ہندوستان۔ عراق۔ چین اور کئی دوسرے ایشیائی اور افریقی ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات زیادہ گہرے اور بہت قدیم تھے۔ شرقِ اوسط کی تجارتی منڈیوں میں یورپی تاجروں کے ساتھ ایشیائی اور افریقی ممالک کے تاجر بھی نہایت کثرت سے دکھائی دیتے تھے۔

مشرق و مغرب کی تجارت کا مرکز

اس زمانہ میں قاہرہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور وہ تمام دنیا کی نگاہوں

کا مرکز بن گیا۔ بیبرس جیسے طاقتور فرماں روا کا دار الحکومت ہونے کی وجہ سے اس کی سیاسی اہمیت تو پہلے ہی مسلّم تھی لیکن بین الاقوامی تجارت کی گرم بازاری نے اس کو مشرق و مغرب کے درمیان ایک بہت بڑی منڈی کی حیثیت بھی دے دی۔ قاہرہ کی یہ اہمیت مملوکوں کے سارے دورِ حکومت میں برقرار رہی۔

اہم برآمدات

بیبرس کے زیرِ اقتدار ممالک (مصر۔ شام۔ فلسطین۔ لبنان وغیرہ) سے جو چیزیں باہر کے ملکوں (بالخصوص یورپی ممالک) کو بھیجی جاتی تھیں ان میں سے چند اہم برآمدات کے نام یہ ہیں:

چینی (شکّر) روئی۔ بلّوری اور گلی ظروف۔ کتان۔ سوتی اور ریشمی کپڑے۔ کمبل۔ ریشم۔ عطریات۔ بخورات۔ رنگین اور منقّش کپڑے۔ قالین۔ چینی کے برتن۔ موتی۔ کانچ کی چیزیں۔ ہاتھی دانت اور دھات کی چیزیں۔ گرم مسالے۔ لکڑی کے چمچے اور برتن۔ روغن زیتون۔ صابون۔ بعلبکی قبائیں۔ معدنی نمک۔ اونی کپڑے۔ خمل (ایک کپڑا جو اونٹ کے بالوں اور ریشم سے بُنا جاتا تھا)۔ جواہرات۔ کچھ خاص قسم کے پھل وغیرہ۔

اہم درآمدات

جو چیزیں باہر کے ملکوں سے درآمد کی جاتی تھیں ان کے نام یہ ہیں:

ریشم (چین سے) اونی اور سوتی کپڑے (مغربی ممالک سے) گرم مسالے (عرب، لنکا، ہندوستان اور دوسرے گرم ممالک سے) موتی (خلیج فارس

سے) ہاتھی دانت اور شتر مرغ کے پر (سوڈان سے) ان درآمدات کا بہت سا حصہ معتدل منافع پر یورپی ممالک کو برآمد کر دیا جاتا تھا۔

اہم اشیائے تجارت اور ان کے مراکز

سلطان بیبرس کے عہد میں اہم اشیائے تجارت اور ان کے مراکز یہ تھے:

اشیائے تجارت	مراکز
چینی (شکر)، روئی، عطریات، ریشم کی ڈوری والی کمانیں، جواہرات۔	دمشق اور لبنان کا علاقہ قاہرہ۔
منقش اور رنگین کپڑے، قالین، ریشم، کانچ کی چیزیں، چینی کے برتن، ہاتھی دانت اور دھات کی چیزیں۔ تلواریں، نیزے، تیر اور ترکش، گرم مسالے۔	دمشق، حلب، لبنان اور فلسطین کے علاقے
روغن زیتون، صابون اور بحری جہاز بنانے کی لکڑی	لبنان اور فلسطین کے علاقے
موتی اور جواہرات	قاہرہ، یافہ
آلات حرب	قاہرہ، دمشق، دمیاط
کمبل	لبنان کا علاقہ
اونی کپڑے اور اون	سیوط (اسیوط) اشمونین اور لبنان کے بعض علاقے
بلوری اور رنگلی ظروف	شام، لبنان اور فلسطین کے علاقے
سوتی اور ریشمی کپڑے	شام، لبنان اور فلسطین کے علاقے

نفیس چوبی برتن اور چمچے	لبنان کا علاقہ
لکڑی کے چمچے اور برتن، جن پر سونے چاندی کے پترے جڑے ہوتے تھے	فلسطین اور لبنان کے علاقے
بحری جہاز اور کشتیاں	اسکندریہ۔ دمیاط۔ جزیرۂ روضہ
خمل	فلسطین اور لبنان
مختلف قسم کے پھل	شام اور لبنان کے علاقے
معدنی نمک	اسکندریہ
نطرون	طرّانہ
جالی دار ریشمی شالیں۔ اعلیٰ قسم کے سیاہ و سرخ مٹی کے برتن۔ کتان۔ اور اس سے بنی ہوئی چیزیں۔ قدیم ارمنی طرز کے بنے ہوئے قالین۔ افیون۔	سیوط (اسیوط)
ارمنی قرمزی قالین۔ اون اور اونی کپڑے۔	الاشمونین

بین الاقوامی تجارت کے علاوہ اندرونِ ملک میں بھی تجارت زوروں پر تھی اور ملک کے مختلف علاقوں کے مابین مالِ تجارت کا مبادلہ کثرت سے ہوتا تھا۔ پھل۔ اناج اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء بلا روک ٹوک ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھیجی جا سکتی تھیں۔ مالِ تجارت کی نقل و حمل بحری جہازوں کشتیوں۔ اونٹوں اور گھوڑوں کے ذریعے ہوتی تھی۔

صیغۂ رفاہِ عام (پبلک ورکس)

علامہ شبلی نعمانی رح "الفاروق" میں لکھتے ہیں :

"یہ صیغہ (یعنی پبلک ورکس) زمانۂ حال کی ایجاد ہے اور یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اس کے لیے اصطلاحی لفظ نہیں۔ مصر و شام میں اس کا ترجمہ "نظارتِ نافعہ" کیا گیا ہے۔ اس صیغہ میں مفصلۂ ذیل چیزیں داخل ہیں :

سرکاری عمارات۔ نہریں۔ سڑکیں۔ پل۔ شفاخانے۔"

دوسرے مؤرخین نے امورِ رفاہِ عامہ میں اوقاف۔ مدارس و مکاتب سرائیں اور مہمان خانوں کو بھی شامل کیا ہے۔ آج جب ہم چھ سات سو برس قبل کے حالات قلم بند کرتے ہوئے "صیغۂ رفاہِ عام" کا عنوان قائم کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس دور میں صیغۂ رفاہِ عام (نظارتِ نافعہ) کے نام سے واقعی کوئی الگ محکمہ قائم تھا۔ دراصل یہ عنوان اس زمانے کے رفاہِ عامہ کے کاموں کا مجموعی تاثر دینے کے لیے قائم کیا جاتا ہے ورنہ اس قسم کے ہر کام کی الگ حیثیت تھی اور اس پر مختلف مدّوں سے خرچ کیا جاتا تھا۔

الملک الظاہر بیبرس کا عہد تلواروں کی جھنکار، طبل و بوق کی گونج اور صفوفِ جنگ کے غوغائے رستخیز کا زمانہ تھا۔ اگر ایسے حالات میں عہدِ بیبرس کی تاریخ کا صفحۂ رفاہِ عام بالکل خالی ہوتا تو چنداں حیرت کی بات نہیں تھی۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ کتبِ تاریخ کے صفحات بیبرس کے کارہائے رفاہِ عام کے ذکر سے جگمگا رہے ہیں تو فی الواقع حیرت ہوتی ہے۔ ان کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن

اُن کی تفصیل میں جانا بے کار ہے کیونکہ آج کے مصر و شام میں بیبرس کے آثارِ خیر میں سے محض چند ایک کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں باقی سب فنا کے گھاٹ اتر گئے اور آج اُن کا کوئی نام تک نہیں جانتا ...... زمانہ بدل گیا۔ ملکوں کی حدود بدل گئیں مقامات کے نام بدل گئے اب تو ان ملکوں کے باشندے بھی ان کا کھوج لگانے سے قاصر ہیں دوسرا کوئی کیا لگائے گا۔ بہرحال سلطان کے رفاہی کارناموں کا ایک اجمالی خاکہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

سڑکیں

سلطان نے نئی سڑکیں بنانے اور پرانی سڑکیں درست کرانے پر خاص توجہ دی اس طرح اس کے تمام ممالکِ محروسہ میں سڑکوں کا جال بچھ گیا جن سے نہ صرف عام لوگوں کو فائدہ پہنچا بلکہ فوجوں کی نقل و حرکت کے سبب بھی آسانی پیدا ہو گئی۔ اس کے عہد میں مصر و شام کے مراکز ایک عمدہ شاہراہ کے ذریعے ملا دیے گئے اور اس پر متعدد جگہ ڈاک کی چوکیاں اور سرائیں قائم کی گئیں۔ عرب مؤرخین کا بیان ہے کہ مصر اور شام کے درمیان آمد و رفت کا اتنا عمدہ انتظام تھا کہ سلطان ہفتے کے شروع میں دمشق میں چوگان کھیلنے کے بعد روانہ ہو جاتا اور ہفتے کے آخر میں قاہرہ پہنچ کر چوگان کھیلتا۔ اس شاہراہ کے ذریعے ڈاک کی ترسیل اور سامان کی حمل و نقل نہایت تیزی کے ساتھ ہو سکتی تھی۔

اوقاف

مسلمان سلاطین میں دستور تھا کہ ایسی جاگیریں جو ان کی طرف سے مساجد، مدارس اور شفاخانوں وغیرہ کے متعلق مرحمت ہوتی تھیں، علی العموم وقف سمجھی

جاتی تھیں اور وقف میں شرعاً کسی کو تصرف کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے چنانچہ جو نیا حکمران مسندِ اقتدار پر بیٹھتا وہ کچھ نہ کچھ اپنی طرف سے اضافہ کرتا تھا اگر اضافہ نہ کر سکتا تھا تو پرانے اوقاف کو ضرور قائم رکھتا تھا۔ سلطان بیبرسؒ سے پہلے مصر و شام وغیرہ میں سلطان نورالدین زنگیؒ اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے بے شمار مذہبی اور خیراتی اوقاف قائم کیے تھے۔ سلطان بیبرسؒ نے ان سب کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اپنی طرف سے بھی اُن میں بہت کچھ اضافہ کیا۔

عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق سلطان کے عہد میں اوقاف کا ایک مستقل صیغہ قائم تھا اس صیغہ کی نگرانی کسی نہایت ذمہ دار اور متدین آدمی کے سپرد کی جاتی تھی۔ مصر میں محکمہ اوقاف کے افسر اعلیٰ قاضی القضاۃ تاج الدین بن بنت الاعز تھے۔ سلطان نے اپنی خاص ملکیت لاوارثوں اور بیکسوں کی تجہیز و تکفین کے لیے وقف کر دی تھی۔ اسی طرح اُس کے امراء رفاہی کاموں کے لیے اپنی جاگیریں وقف کرتے رہتے تھے۔ اوقاف کی آمدنی لاکھوں دینار تک پہنچتی تھی اور اس کا بیشتر حصہ مدرسوں، شفا خانوں، مسجدوں، سراؤں اور مہمان خانوں پر صرف کیا جاتا تھا۔ اس طرح مدرسوں میں زبردست رونق تھی مسجدیں آباد تھیں شفا خانوں سے ہزاروں لوگ بغیر کسی خرچ کے فیض یاب ہوتے تھے اور سراؤں اور مہمان خانوں میں مسافر اور اجنبی گھر جیسا آرام پاتے تھے۔ فی الحقیقت عہد بیبرس میں علم کی اشاعت اور مخلوقِ خدا کو فیض پہنچانے میں اوقاف نے بڑا قابلِ قدر کام کیا۔

مدارس و مکاتب

دورِ حاضر میں تو حصولِ علم کے ذرائع اور مقاصد یکسر بدل گئے ہیں لیکن

قرونِ وسطیٰ میں ممالکِ اسلامیہ کے مسلمان تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کو ایک مذہبی فریضہ اور کارِ خیر خیال کرتے تھے اور طلبہ کی امداد، علم کی اشاعت، کتب و سامانِ درس و تدریس کے وقف، مدارس و مکاتب کی بناء و تاسیس اور علماء کی خدمت و اعانت کو ایک مذہبی حکم اور برکت و فلاحِ دارین کا باعث سمجھتے تھے۔ اگر ان کو کوئی علم پرور حکمران میسر آجاتا تو وہ سونے پہ سہاگہ ثابت ہوتا تھا۔ سلطان بیبرس ایک علم دوست اور معارف نواز فرماں روا تھا۔ اہلِ علم کی قدر دانی اور سرپرستی اس کا فطری خاصہ تھا۔ چنانچہ اس کی سلطنت میں علماء، فضلاء، فقہاء، صلحاء، فلاسفر، مجتہدین، مؤرخین، ادباء، حکماء، اطبّا اور دوسرے اہلِ فن و ہنر کا ایک ایسا بے نظیر اجتماع ہو گیا تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دور کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے سلطان نور الدین محمود زنگیؒ اور ایّوبی سلاطین (بالخصوص سلطان صلاح الدینؒ) مصر و شام میں سینکڑوں مدرسے قائم کر چکے تھے جن میں سے بیشتر بیبرس کے عہد تک نہایت حُسن و خوبی سے چل رہے تھے۔ سلطان نے ان مدارس کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ ان میں بہت سے مدرسوں کا اضافہ بھی کیا۔ تاتاریوں کی یورش میں شام کے جن مدرسوں کو نقصان پہنچا تھا سلطان نے ان کی از سرِ نو تعمیر یا مرمّت کرائی اور ان کو پرانی صورت پر بحال کر دیا۔ ان مدارس کے لیے سلطان نے لاکھوں دینار آمدنی کی جاگیریں وقف کیں اور اس کے اُمرا نے اس کارِ خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ غرض عہدِ بیبرس میں گلشنِ علم پہ بہارِ تازہ آگئی اور تشنگانِ علم دُور دُور سے کھنچ کر مصر و شام میں آنے لگے۔

اس زمانہ میں تعلیم و تعلّم کے لیے عموماً علیحدہ عمارتیں نہیں ہوتی تھیں بلکہ مساجد کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علماء کے مکانات مدارس یا مکاتب کا کام دیتے تھے۔ تاہم بغداد میں مدرسہ نظامیہ کے قیام کے بعد سے مدرسوں کے لیے

الگ خاص عمارتیں بھی بننے لگیں[1]۔ لیکن ایسی عمارتوں کی تعداد بہت کم تھی اور اکثر مدارس اور مکاتب مساجد ہی سے ملحق تھے ان مساجد کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کے رہنے کے لیے حجرے اور مکانات بنائے جاتے تھے۔ قدیم خانقاہیں اور سلاطین اور بزرگانِ کرام کے روضے اور مقبرے بھی درس گاہوں کا کام دیتے تھے۔ ان مدرسوں کے اساتذہ میں علماء اور فقہاء بھی تھے اور محدثین و مفسرین بھی۔ نحوی اور متکلمین بھی تھے اور فلاسفہ و مجتہدین بھی۔ انہی مدرسوں نے ایسے ایسے اہلِ کمال پیدا کیے کہ دنیائے اسلام آج تک ان پر ناز کر رہی ہے۔

سلطان بیبرس کے عہد میں قاہرہ۔ اسکندریہ۔ دمشق۔ حلب۔ حماۃ۔ حمص۔ اور بعلبک وغیرہ میں سینکڑوں مدرسے تشنگانِ علم کو سیراب کر رہے تھے۔ ان مدرسوں میں قاہرہ کے مدرسہ صلاحیہ۔ شافعیہ۔ قمحیہ۔ زین التجار۔ شریفیہ۔ مشہد امام حسین رضؓ۔ سوفیہ۔ الازہر۔ ظاہریہ۔ دمشق کے مدرسہ نوریہ۔ عادلیہ۔ ابن عمر۔ جامع دمشق۔ رکنیہ رواحیہ۔ مالکیہ۔ عصمیہ۔ حلب کے مدرسہ ابن شداد اور شاد بخت اور بعلبک کے مدرسہ النجمیہ کو شہرتِ عام حاصل تھی۔ علامہ سیوطی رحؒ کا بیان ہے کہ قاہرہ کا مدرسۃ الظاہریہ سلطان بیبرس رحؒ نے ۶۶۲ھ میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور اس میں علامہ تقی بن رزین رحؒ کو فقہ شافعیہ کی تدریس کے لیے اور امام شرف الدین

---

[1] مدرسۂ نظامیہ کی بنیاد سلطان ملک شاہ سلجوقی کے نامور وزیر خواجہ نظام الملک طوسی نے ۴۵۷ھ میں رکھی اور دو برس بعد اس کی تکمیل ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس مدرسے کی شاخیں نیشاپور۔ اصفہان۔ موصل۔ مرو۔ جزیرہ ابن عمر۔ خوزستان۔ بصرہ۔ ہرات بلخ۔ طوس وغیرہ میں بھی قائم ہوگئیں۔

باطیؒ کو حدیث کی تدریس کے لیے مقرر کیا" سلطان کی مملکت کے دوسرے
رس میں بھی اس دور کے سربرآوردہ علماء و فقہاء تعلیم دیتے تھے اور حکومت کی
ف سے ان کے معقول مشاہرے مقرر تھے۔ طلبہ کی رہائش، خورد و نوش، لباس
دوسری ضروریات کا خرچ بھی حکومت برداشت کرتی تھی۔ جو لوگ ان درسگاہوں
ے فارغ التحصیل ہوتے تھے ان کو سرکاری ملازمتوں میں لے لیا جاتا تھا اور اگر وہ
کاری ملازمت اختیار نہ کرنا چاہتے تو اپنی مرضی اور ذوق کے مطابق کوئی پیشہ
تیار کر سکتے تھے۔ ان پیشوں میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو خاص
ہمیت حاصل تھی۔

شفاخانے

مصر و شام میں سلطان بیبرس کے عہد سے پہلے ہی کثرت سے شفاخانے
قائم تھے۔ ان میں سب سے بڑا شفاخانہ دمشق کا بیمارستان کبیر تھا جو سلطان
نورالدین محمود زنگیؒ نے چھٹی صدی ہجری میں قائم کیا تھا۔ دوسرے دو بڑے شفاخانے
قاہرہ اور اسکندریہ میں تھے جو مجاہد کبیر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے قائم کئے تھے
اور اسی کے نام سے موسوم تھے۔

بیمارستان کبیر دمشق جب سے قائم ہوا تھا اس کے چولھے کی آگ کبھی نہیں
بجھی تھی۔ اس میں امیر، غریب، مقیم، مسافر، غلام، آزاد سب کا علاج مفت ہوتا
تھا اور غذا بھی شفاخانے کی طرف سے بلاقیمت مہیا کی جاتی تھی اس شفاخانے
میں نہایت قابل اور حاذق اطبّا ملازم تھے۔ اس شفاخانہ کی ایک اہم خصوصیت
یہ تھی کہ یہاں علمِ طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی جس میں تشخیصِ امراض۔ علاج اور دواسازی
بھی کچھ شامل تھا۔ گویا یہ شفاخانہ ایک عظیم طبی درس گاہ کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔

یہاں طبیبوں، دواسازوں، جراحوں اور کحالوں کا امتحان لیا جاتا تھا۔ جب تک کوئی شخص امتحان میں کامیابی کی سند حاصل نہ کر لیتا تھا اس کو علاج کرنے یا کسی قسم کی دوا بنانے اور فروخت کرنے کی اجازت نہ تھی اس شفاخانہ میں عورتوں کے لیے ایک الگ حصہ تھا۔ اسی طرح اس کا ایک حصہ دماغی امراض کے مریضوں کے لیے اور ایک حصہ جراحی (آپریشن) کے لیے مخصوص تھا۔

قاہرہ کا بیمارستان صلاح الدین غازی کے ایک شاندار محل میں قائم اور اس میں مریضوں کے آرام و آسائش کے لیے دنیا بھر کے سامان مہیا کر دیے گئے تھے۔ اس میں بہت سے لائق طبیب، جراح اور علمائے طبیعیات ملازم تھے جو صبح و شام دونوں وقت مریضوں کا معائنہ کرتے تھے اور ان کے لیے مناسب ادویہ و اغذیہ تجویز کرتے تھے۔

دمشق کے بیمارستان کبیر کی تقلید میں یہاں بھی عورتوں کے علاج کے لیے الگ انتظام تھا اور امراض دماغی کے مریضوں کے لیے ایک الگ حصہ مخصوص تھا جس کا احاطہ نہایت وسیع تھا اور دریچوں میں لوہے کی جالیاں لگی ہوئی تھیں اس کے علاوہ قاہرہ میں ایک اور عظیم الشان شفاخانہ بھی تھا جو قریب قریب اسی درجے کا تھا۔

اسکندریہ کا شفاخانہ بھی نہایت اعلیٰ پیمانے پر قائم تھا اس شفاخانہ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ جو لوگ کسی وجہ سے شفاخانے میں داخل ہو کر علاج کرانا پسند نہیں کرتے تھے ان کے علاج کے لیے الگ طبیب اور جراح مقرر تھے جو ان کے گھروں میں جا کر علاج کرتے تھے۔

ان شفاخانوں کے علاوہ حلب، حماۃ، حمص اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی کئی اچھے شفاخانے موجود تھے۔ سلطان بیبرس کو اگرچہ خود کوئی بڑا شفاخانہ

کرنے کا موقع نہ ملا تاہم جو شفا خانے پہلے سے قائم تھے۔ اس نے ان کی بھرپور سرپرستی کی۔ ان شفا خانوں کے اخراجات کے لیے جو اوقاف قائم تھے سلطان نے ان میں کئی زرخیز دیہات کا اضافہ کیا۔ وہ علماء کی طرح اطباّ کا بھی بیحد احترام کرتا تھا اور انہی کو گراں قدر وظائف دیتا تھا۔ سلطان کے امراء بھی اطباّء کے مربّی اور قدرداں تھے اور اُن کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتے تھے۔

نہریں

پیچھے ذکر آ چکا ہے کہ سلطان نے اپنی مملکت میں زراعت کو ترقی دینے پر خاص توجہ دی۔ چنانچہ زمینوں کی آبپاشی کے لیے اس نے متعدد بڑی بڑی نہریں کھدوائیں ان نہروں کی بدولت زمینیں سونا اگلنے لگیں اور ملک کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔ گو آج امتدادِ زمانہ نے سلطان کی کھدوائی ہوئی نہروں کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے تاہم کم و بیش سبھی مؤرخین نے شہادت دی ہے کہ سلطان نے نہریں کھدوانے میں خاص دلچسپی لی یہاں تک کہ بعض مواقع پر اس نے کھدائی کے کام میں خود حصہ لیا۔

تعمیرات

سلطان بیبرس کی تعمیرات میں کچھ رفاہِ عام اور صیغۂ مذہبی سے تعلق رکھتی تھیں اور کچھ فوجی اور دفاعی ضروریات سے متعلق تھیں۔ مؤرخین نے اس کی جن تعمیرات کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے :۔

۱۔ پُل ۔ سلطان نے ملک کے ہر گوشہ میں دریاؤں، ندی نالوں اور نہروں پر پُل تعمیر کرائے۔ یہ پُل دو قسم کے تھے :۔

(ا) **شاہی پُل** : یہ پُل ملک کے عام مفاد کے لیے بنائے گئے تھے اور لگان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اُن پر خرچ کیا جاتا تھا۔

(ب) **مقامی پُل** : یہ پُل "بلادیہ" کہلاتے تھے۔ ان کا مفاد مقامی تھا اور ان کی تعمیر کا خرچ مقامی کاشت کاروں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

"فلپ کے حِتی" نے "تاریخ شام" میں لکھا ہے کہ سلطان نے دریائے اردن پر ایک شان دار پُل بنوایا اس پر اپنا کتبہ لگوایا اور اس کتبے کے دونوں جانب شیر نصب کرائے (بیبرس کا طغرا شیر ببر تھا)[1]

۲- **جہاز سازی کے کارخانے** : سلطان نے اسکندریہ اور دمیاط میں جنگی جہاز بنانے کے لیے عظیم الشان کارخانے قائم کیے اور ان کے لیے خام مال (لکڑی لوہا وغیرہ) مہیا کرنے کے خاص انتظامات کیے۔ اس نے تمام ان لکڑیوں کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی جو جہاز سازی کے کام آسکتی تھیں۔

۳- **بندرگاہوں کی اصلاح** : سلطان نے مصر اور شام کی کئی بندرگاہوں کی اصلاح کی اور ان میں تجارتی اور جنگی جہازوں کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کی۔ دمیاط کی بندرگاہ کو جسے لوئی نہم کی صلیبی مہم نے تباہ کر دیا تھا از سرِ نو تعمیر کرایا۔

۴- **سرائیں اور مہمان خانے** : سلطان نے قاہرہ، اسکندریہ، دمشق، حلب اور کئی دوسرے مقامات پر متعدد سرائیں اور مہمان خانے

---

[1] یہ پُل آج بھی موجود ہے اور "جسر الدامیہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پُل اب خشک زمین پر ہے کیونکہ یہاں دریا نے اپنا رُخ بدل لیا ہے۔ سلطان نے یہ پُل ۱۲۶۶ء میں بنوایا تھا۔

تعمیر کرائے جن سے ہر مذہب و ملّت کے مسافر استفادہ کر سکتے تھے۔

۵۔ **محجر روضۂ نبوی**: ۶۶۷ھ میں سلطان حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر مدینہ منوّرہ گیا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ لوگ قبرِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے بہت قریب آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اس میں کسی قدر سوئے ادب پایا جاتا تھا۔ سلطان نے قبر مبارک کے چاروں طرف ایک محجر بنوا دیا جو ابھی تک موجود ہے۔

۶۔ **مساجد**: مساجد کی تعمیر و مرمت کے سلسلے میں سلطان کو جو سب سے بڑی سعادت نصیب ہوئی وہ مسجدِ نبویؐ کے ایک حصے کی مرمت و تعمیر تھی۔ یہ حصہ چند سال پہلے آگ لگنے سے گر گیا تھا۔ بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ نے اس کی تعمیر شروع کرائی لیکن سقوطِ بغداد کی وجہ سے یہ کام ادھورا رہ گیا تھا۔ سلطان بیبرس نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس کام کی طرف توجہ کی اور نہایت محبت اور عقیدت کے ساتھ اس حصے کو مکمل کرایا۔

اس سے دُوسرے درجے پر سلطان کا نمایاں کام مسجد الازہر (قاہرہ) کی مرمت کرانا تھا۔ الازہر کی عمارتیں مدت سے کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھیں۔ سلطان نے ان کی مرمت ایسے عمدہ طریقے سے کرائی کہ ان کی گزشتہ شان و شوکت بحال ہو گئی۔ اس کارِ خیر میں اس عہد کے دو امیروں عزالدین ایدمر الحلی اور بلبک الخازندار نے بھی نمایاں حصہ لیا۔ مرمت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے الازہر میں سُنّی معلّمین رکھنے کے لیے کچھ اوقاف مخصوص کر دیے اس طرح الازہر میں دوبارہ جان پڑ گئی۔ الازہر کے علاوہ سلطان نے کئی دوسری تاریخی مسجدوں کی مرمت بھی کروائی جن میں قبۃ الصخرا بھی شامل تھا۔ تاتاریوں کے حملے میں شام کی کئی

مسجدوں کو نقصان پہنچا تھا سلطان نے ان سب کی مرمت کرائی یا ان کی از سرِ نو تعمیر کرائی۔

۶۶۵ھ میں سلطان نے قاہرہ میں ایک عظیم الشان مسجد بنانے کا حکم دیا۔ اس مسجد کی تعمیر کا کام دو سال تک جاری رہا۔ جب یہ بن کر تیار ہوئی تو سلطان نے اس کو "جامع حسنیہ" کا نام دیا اور اس میں حنفی خطیب مقرر کیا۔

۷۔ **قلعے اور شہر پناہیں**: تاتاری یورش میں شام کے کئی قلعوں اور شہر پناہوں کو سخت نقصان پہنچا تھا۔ سلطان نے خاص اہتمام سے ان کی مرمت کرائی اور ان کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط بنا دیا۔ ان میں حلب، حماۃ اور دمشق کے قلعے اور شہر پناہیں قابلِ ذکر ہیں۔ سلطان نے صلیبیوں کے اکثر قلعے فتح کرنے کے بعد مسمار کرا دیے تھے لیکن جب اس نے ۶۷۱ھ میں حصن الاکراد کا "ناقابلِ تسخیر" قلعہ فتح کیا تو اس کو مسمار کرنے کے بجائے اس کی دوبارہ مرمت کرائی اور وہاں اپنا کتبہ نصب کرایا۔

اس سلسلہ میں سلطان کا سب سے اہم کام جزیرۂ روضہ کے قلعے کی تعمیر تھا۔ یہ عظیم الشان قلعہ پہلے الملک الصالح نے بنوایا تھا اور اس میں مملوکوں کو آباد کیا تھا۔ ۶۴۸ھ میں عزالدین ایبک (معز جاشنگیر) تخت نشین ہوا تو اس نے اس قلعہ کو مسمار کرا دیا اور اس کے سازو سامان کو قلعہ جبل میں منتقل کرا دیا۔ سلطان بیبرس نے برسرِ اقتدار آ کر اس قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کرائی اور اس کو اسی معیار پر پہنچا دیا جس پر وہ الملک الصالح نجم الدین ایوب کے عہد میں تھا اس قلعہ کے برجوں میں سلطان کی اجازت سے مملوک امراء قیام پذیر ہو گئے۔

الملک الظاہر بیبرسؒ

کے

عہد کے چند اہلِ کمال

۱۔ علامہ ابنِ خلکان رح

۲۔ سید احمد البدوی رح

۳۔ ابن واصل رح

۴۔ شیخ الاسلام امام عزالدین دمشقی رح

۵۔ ابن عبد الظاہر رح

۶۔ علامہ ابن منظور رح

۷۔ سبط ابن الجوزی رح

۸۔ قاضی جمال الدین بن مالک طائی رح

۹۔ قاضی بدرالدین ابن جماعۃ رح

۱۰۔ ابنِ شداد حلبی رح

۱۱۔ قاضی عبدالرحمٰن بن قدامہ رح

۱۲۔ ابو شامہ مقدسی رح

۱۳۔ ابن ابی اصیبعہ رح

۱۴۔ ابن النفیس رح

۱۵۔ قاری جمال الدین رح

۱۶۔ شیخ القرآء کمال الدین مصری رح

۱۷۔ شیخ محمد بن مکی صقلی رح

۱۸۔ ابوالفضل مہنا بن دمشقی رح (طبیب)

۱۹۔ امام نووی رح

۲۶۰

علّامہ ابن خلّکانؒ

علّامہ شمس الدین ابو العباس احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلّکان البرمکی الشافعی ۶۰۸ھ/۱۲۱۱ء میں بمقام اربلیہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد اربلیہ کے مدرسۂ مظفریہ میں معلّم تھے۔ ان کا تعلق بلخ کے برمکی خاندان سے تھا۔ ابنِ خلکان نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر شام تشریف لے گئے اور حلب و دمشق میں کئی سال مقیم رہ کر مختلف علومِ اسلامی میں سندِ تکمیل حاصل کی۔ ان کے اساتذہ میں قاضی ابنِ شدّاد کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے[1]

علّامہ ابنِ خلکان نے اپنے علمی مشاغل کے سلسلہ میں اسکندریہ اور قاہرہ کا سفر بھی کیا۔ پھر مستقل طور پر دمشق میں مقیم ہو گئے۔ چند سال کے اندر اندر ان کے تبحّرِ علمی اور ذہانت کی شہرت سارے شام و مصر میں پھیل گئی۔ ۶۶۳ھ/۱۲۶۴ء میں سلطان بیبرس نے اُن کو قاضی یوسف ابن الحسن سنجری کی جگہ شام کا

---

[1] بہاؤالدین ابوالمحاسن یوسف بن رافع معروف بہ ابن شداد ۵۳۹ھ/۱۱۴۵ء میں بمقام موصل پیدا ہوئے۔ موصل و بغداد میں تعلیم پائی اور پھر خود وہاں پڑھانے لگے۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ نے ان کو قاضی العسکر مقرر کر دیا۔ سلطان کی وفات کے بعد وہ حلب کے قاضی مقرر ہوئے اور وہاں متعدد مدارس قائم کیے۔ اپنے علم و فضل کی بدولت تمام عالمِ اسلام میں بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ انھوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی سیرت "محاسن الیوسفیہ" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب نے علمی حلقوں میں بڑی شہرت پائی۔ قاضی ابن شداد نے ۶۳۲ھ/۱۲۳۵ء میں وفات پائی۔

قاضی القضاۃ مقرر کیا۔ اگرچہ وہ خود شافعی المسلک تھے لیکن چاروں فقہی مسالک کے قضاۃ اُن کے ماتحت تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب سلطان نے ہر ایک مسلک کے قاضیوں کا محکمہ جُدا کر دیا تو علامہ موصوف کو شافعی مذہب کے عہدۂ قضاء پر قائم رکھا۔ سات سال کے بعد وہ عہدۂ قضاء سے سبکدوش ہو کر قاہرہ چلے گئے اور وہاں کے مدرسۂ فخریہ میں پروفیسر ہو گئے۔ سلطان بیبرس کی وفات کے بعد ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں وہ دوبارہ قاضی مقرر کیے گئے۔ لیکن ایک سال کے بعد بغاوت کی سازش میں متّہم ہوئے اور اپنے عہدہ سے معزول کر دیے گئے۔ اس کے بعد وہ عزلت نشین ہو گئے۔ ۲۶ رجب ۶۸۱ھ (مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۲۸۲ء) کو وفات پائی۔

علامہ ابن خلّکان کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں بڑا اونچا مرتبہ حاصل ہے۔ اور یہ مرتبہ دلانے میں ان کی مہتم بالشان تصنیف

"وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان"

کا بڑا حصہ ہے۔ اس کتاب کو "تاریخ ابن خلّکان" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کتاب ایک بہت بڑی تاریخی قاموس ہے جس میں ہر طبقہ کے مشاہیرِ اسلام کے حالات درج ہیں۔ علامہ موصوف نے اس کتاب کو ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں لکھنا شروع کیا اور اٹھارہ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۶۷۲ھ/۱۲۷۴ء میں مکمل کیا۔ اہلِ علم کے نزدیک یہ کتاب ایک اہم ماخذ اور سند کی حیثیت رکھتی ہے اس کتاب کی خصوصیات یہ ہیں:-

۱۔ اس کی زبان سادہ اور ادبی ہے۔

۲۔ اس میں کسی خاص طبقے کے بجائے ہر طبقۂ مشاہیر کے حالات درج ہیں۔ ان میں علماء۔ فقہاء۔ اطباء۔ شعراء۔ صلحاء۔ ملوک۔ امراء۔ وزراء وغیرہ ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔

۳- ہر صاحب ترجمہ کی ولادت اور وفات کی تاریخیں درج کرنے میں ممکن حد تک صحت سے کام لیا ہے۔

۴- ہر شخص کی وہ صفات درج کردی ہیں جو اس کے کردار کی عکاس ہیں۔

۵- جن ناموں کے تلفظ میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے اُن کی حرکات مفصل لکھ دی ہیں۔

۶- ہر صاحب ترجمہ کا نسب جتنی دُور تک معلوم ہو سکا ہے درج کر دیا ہے۔

۷- جگہ جگہ دلچسپ واقعات۔ اشعار اور نوادر درج کیے ہیں جن سے کتاب بے حد دلچسپ ہو گئی ہے اور قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ "وفیات الاعیان" کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ چند سال ہوئے اس کے ایک حصے کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ اس کے مترجم عبدالغفور رامپوری تھے اور یہ مطبع مفید عام آگرہ سے "مشاہیر اسلام" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سید احمد البدوی رح

نام احمد، کنیت ابُو الفتیان، القاب "السید"، "العطاب[1]"، "العضبان[2]" "الصمّات[3]"، "جابی بالاسیر[4]"، "ابو فراج[5]"، "القطب"، "شیخ العرب" اور "البدوی[6]"

---

[1] نڈر شہسوار یا غضب ناک
[2] غضب ناک۔ صاحب جلال
[3] خاموش
[4] قیدی کو واپس لانے والا
[5] رہا کرانے والا
[6] سید احمد المغرب کے بدویوں کی طرح منہ پر نقاب ڈالے رہتے تھے اس لیے ان کو البدوی کہا جاتا تھا۔

ان کا شمار ساتویں صدی ہجری کے مشاہیر صوفیہ میں ہوتا ہے ۔ ۵۹۶ھ ۱۱۹۹ - ۱۲۰۰ء میں مغربِ اقصیٰ کے شہر فاس میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام علی (البدوی) اور والدہ کا نام فاطمہ تھا ۔ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والدین کے ہمراہ مکہ معظمہ گئے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے ۔ سیّد احمد نے مختلف استادوں سے کلامِ مجید (قراءتِ سبعہ کے مطابق) پڑھا اور فقہ شافعی کا مطالعہ بھی کیا ۔ ۶۲۷ھ ۱۲۳۰ء میں ان کی طبیعت میں ایک انقلاب پیدا ہوا اور وہ لوگوں سے کنارہ کشی کر کے اپنا سارا وقت نفس کشی اور ریاضت میں گزارنے لگے ۔ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے اور اپنا مافی الضمیر اشاروں سے ظاہر کرتے تھے ۔ ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء میں مکہ معظمہ سے بغداد گئے اور سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور سیّد احمد الکبیر رفاعیؒ کے مزاروں پر حاضری دی ۔ ۶۳۴ھ ۱۲۳۷ء میں مصر کے شہر طنطا تشریف لے گئے اور وہاں مستقل اقامت اختیار کر لی ۔ کہتے ہیں کہ وہ طنطا میں بڑی جاں گداز ریاضتیں کرتے تھے کبھی طویل عرصے تک عالمِ سکوت میں رہتے تھے کبھی چالیس چالیس دن تک کچھ نہ کھاتے تھے اور کبھی سورج کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہتے تھے یہاں تک کہ ان کی آنکھیں سُرخ انگارہ ہو گئی تھیں ۔ جلد ہی وہ مرجعِ خلائق بن گئے اور مصر کے گھر گھر میں ان کے کشف و کرامات کا چرچا ہونے لگا ۔ اُن کے عقیدتمندوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے یہاں تک کہ فرماں روائے مصر سلطان بیبرس بھی ان سے حد درجہ عقیدت رکھتا تھا ۔ بعض مؤرخین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلطان اُن کے مُریدوں میں شامل ہو گیا تھا ۔ سلطان نے سید احمد البدویؒ کی بیعت کی ہو یا نہ ہو اتنا ضرور ثابت ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا اور نہایت احترام اور عقیدت کے ساتھ اُن کی قدم بوسی کیا کرتا تھا ۔ سید موصوف نے ۱۲ ربیع الاول ۶۷۵ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۲۷۶ء کو وفات پائی ۔ طنطا میں

ان کا مزار آج تک مرجع خاص و عام ہے۔ سلسلۂ احمدیہ جسے سید احمد البدویؒ نے قائم کیا مصر کے مقبول ترین سلاسلِ طریقت میں سے ایک ہے۔ اس سلسلہ سے وابستہ لوگ "سطوحیہ" یا "اصحاب السطح" کہلاتے ہیں۔ سید احمد البدویؒ نے تین کتابیں بھی اپنی یادگار چھوڑیں ان کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ وصایا: اس میں عام قسم کی تنبیہات ہیں۔

۲۔ صلوات: (دعاؤں کا مجموعہ)

۳۔ ایک دعا (حزب)

ابنِ واصل

قاضی جمال الدین ابو عبداللہ محمد بن سالم، عہدِ بیبرس کی ایک سرآمدِ روزگار شخصیت تھے۔ ان کے دادا کا نام واصل تھا اور اسی نسبت سے وہ علمی دنیا میں ابنِ واصل کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۶۰۴ھ/۱۲۰۷ء میں تولد ہوئے اور اس دور کے نامور اساتذہ سے مختلف علوم کی تحصیل کی سندِ فراغت کے بعد پہلے حماۃ میں سلسلۂ درس و تدریس شروع کیا اور پھر قاہرہ میں۔ چند سال کے اندر اندر سارے ملک میں ان کے تبحرِ علمی کا غلغلہ ہو گیا اور انہیں امامِ وقت تسلیم کیا گیا۔ مشہور مؤرخ اور جغرافیہ دان علامہ ابو الفداء[1] ان کے شاگرد تھے۔ وہ اپنے

---

[1] علامہ ابو الفداء اسمٰعیل بن علی ایوبی ۶۷۲ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور ۷۳۲ھ میں وفات پائی۔ جوانی میں ایک مجاہد کی حیثیت سے حروبِ صلیبیہ (باقی ص ۲۶۵ پر)

استاد کے متعلق لکھتے ہیں:

"علّامہ قاضی جمال الدین محمد امام وقت اور فضلائے زمانہ میں ہیں۔ مختلف علوم فقہ۔ اصول دین، منطق۔ ہندسہ۔ ہیئت اور تاریخ میں دست گاہِ کامل رکھتے ہیں ان کی مختلف تصنیفات حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مفرج الکروب فی اخبار بنی ایوب
(یعنی تاریخ فرماں روایانِ بنی ایوب)۔
۲۔ رسالۃ الانبرودیۃ فی المنطق (یہ رسالہ شاہ اطالیہ وصقلیہ مینفریڈ کے لیے علم منطق میں لکھا گیا)[1]
۳۔ مختصر الاغانی (یہ کتاب آغانی کی عمدہ تلخیص ہے)"

جلیل القدر استاد سے اپنے استفادہ کا حال علامہ ابوالفداء نے یوں لکھا ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۴) میں شرکت کی۔ پھر عرصہ تک مملوک سلطان الملک الناصر کی ملازمت میں رہے۔ چند سال حماۃ کے گورنر بھی رہے۔ ان کا خاندان مصر کی ایوبی شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لیے مملوک فرماں رواؤں نے ان کو "ملک الصالح" اور "ملک المؤید" جیسے القاب سے نوازا لیکن ان کی شہرت کی بنیاد ان کی تصانیف "مختصر تاریخ البشر" اور "تقویم البلدان" پر قائم ہے۔

[1] قاضی جمال الدین نے منطق پر جو رسالہ لکھا "دائرۃ المعارف الاسلامیہ" میں اس کا نام "نخبۃ الفکر فی المنطق" دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں قاضی موصوف کی ایک اور کتاب التاریخ الصالحی کی نشان دہی کی گئی ہے جو انھوں نے دنیا کی تاریخ پر لکھی تھی۔ اس کتاب کی جلد اول برٹش میوزیم میں موجود ہے اس میں ابتدائے آفرینش سے امام حسینؓ کی وفات تک کے حالات درج ہیں۔

لکھا ہے :

"میں بارہا ان کے پاس حماۃ گیا اور کتاب اقلیدس کی اکثر مشکلات کو ان سے حل کیا اور ان سے استفادہ کیا۔ عروض میں ابن حاجب کے منظوم رسالہ کی شرح بھی میں نے ان سے پڑھی کیونکہ انھوں نے اس رسالہ کی نہایت عمدہ شرح لکھی تھی اور اسی طرح کتاب الاغانی میں جو اسماء ہیں ان کی تصحیح بھی ان سے حاصل کی۔"

سنہ ۶۵۹ھ میں سلطان بیبرس نے اپنی خارجہ حکمت عملی کے تحت اطالیہ و سسلی کے فرماں روا مینفرید سے دوستانہ مراسم قائم کرنے چاہے۔ اس مقصد کے لیے اس کو مینفرید کے پاس بھیجنے کے لیے ایک ایسے سفیر کی ضرورت محسوس ہوئی جو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ اس زمانہ میں قاضی جمال الدین کے علمی فضائل اور خداداد ذہانت کا ملک بھر میں ڈنکا بج رہا تھا۔ اس اہم سفارتی خدمت کے لیے اس کی نگاہِ انتخاب انہیں پر پڑی اور اس نے قاضی موصوف کو اپنا سفیر بنا کر فرماں روائے اطالیہ و سسلی کے دربار میں بھیجا وہ وہاں عرصہ تک رہے اور اپنے قیام کے دوران میں مینفرید کے لیے جو ایک علم دوست اور مسلم نواز بادشاہ تھا، علم منطق پر ایک رسالہ لکھا اس کے ساتھ ہی انھوں نے بادشاہ کی مسلمان رعیت کے حالات کا جائزہ لیا۔ جب وہ اپنی سفارت سے واپس آئے تو سلطان نے ان کے کام پر خوشنودی کا اظہار کیا اور ان کو حماۃ کا قاضی القضاۃ بنا دیا۔ علامہ ابو الفداء کا بیان ہے کہ سفارت سے واپسی کے بعد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے قیام اطالیہ کے واقعات و مشاہدات سنائے جو بیحد دلچسپ تھے ۔۔۔ اس کے بعد

ابوالفداء نے اپنی تاریخ میں ان واقعات و مشاہدات کو قاضی جمال الدین کی زبان سے اجمالاً بیان کیا ہے جن سے اس عہد کے مسلمانانِ اطالیہ کے حالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"مجھے جس امبراطور[1] (امپرر) کے پاس سفیر بنا کر بھیجا گیا اس کے باپ کا نام فردریک[2] (فریڈرک) تھا۔ اس کے سلطان مصر الملک الکامل سے دوستانہ مراسم تھے۔ ۶۴۸ھ میں فردریک کی وفات کے بعد اس کے بیٹے کورا[3] نے برطویل (اٹلی) اور صقلیہ کا تاج و تخت سنبھالا۔ کورا کا جانشین اس کا بھائی مینفرید ا (مینفریڈ) ابن فردریک ہوا۔ ان میں سے ہر بادشاہ کا لقب "امبراطور" یا امبرور" (امپرر) تھا۔ اور امبراطور مینفریدا تمام فرنگی بادشاہوں میں مسلم نوازی اور علم دوستی میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا جب میں اُس کے دربار میں پہنچا تو اس نے میری بڑی تعظیم و تکریم کی اور مجھے برطویل (اٹلی) کے شہروں میں سے ایک شہر

---

[1] عربوں نے "امپرر" (Emperor) کو معرب کر کے امبراطور (Anbratur) یا امبرور (Anberur) بنا لیا۔ علامہ ابوالفداء امبراطور کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ فرنگیوں (فرینکوں) کی زبان میں اس کا مطلب "امراء کا بادشاہ" ہے۔

[2] (Frederic II) صقلیہ کا دوسرا جرمن فرماں روا (عہدِ حکومت ۵۹۴ھ / ۱۱۹۸ء تا ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء)

[3] کورا، کانرڈ (Conard) کا معرب ہے۔ کانرڈ چہارم اطالیہ و صقلیہ کا تیسرا جرمن فرماں روا تھا (عہدِ حکومت ۶۴۸ھ / ۱۲۵۰ء تا ۶۵۲ھ / ۱۲۵۴ء)

اپولیہ[1] میں جو اندلس سے متصل تھا۔ ٹھہرایا۔ مجھے اس کے ساتھ بارہا اکٹھا ہونے کا موقع ملا۔ میں نے اس کو بڑا با اخلاق اور علم دوست پایا۔ اس کو اقلیدس[2] کی دس کتابیں زبانی یاد تھیں . . . . .
اور جس شہر میں میری رہائش تھی اس کے قریب ایک شہر لوجارہ (لوجارہ ؟) کے نام سے موسوم تھا۔[3] اس کے تمام باشندے مسلمان تھے۔ جو جزیرہ صقلیہ (سسلی) کے رہنے والے تھے وہ اس شہر میں باقاعدہ نماز جمعہ ادا کرتے تھے اور بلا روک ٹوک آزادی کے ساتھ اپنے دوسرے مذہبی فرائض بھی انجام دیتے تھے . . . . . . میں نے امبراطور مینفریڈ کے بڑے بڑے

---

[1] اپولیا (Apulia) عربوں نے اس کو معرب کر کے ا[...] یا انبولیہ بنا لیا۔

[2] (Euclid)

[3] "لوجارہ" فی الحقیقت "لوسیرا (Lucera) کا معرب ہے۔ ا[...] نے اپنے جغرافیہ میں اس شہر کا نام لوشیرہ لکھا ہے۔ یہ شہر اٹلی کے صوبہ اپولیا [...] واقع تھا اور فوگیا (Foggia) کے مشہور شہر سے بجانب شمال مغرب ا[...] مسافت ۲۰/۱۲ میل تھی۔ سسلی کے مسلمانوں پر زوال آیا تو وہ عرصہ تک عیسائیوں [...] ظلم و جور کی چکی میں پستے رہے تا آنکہ فریڈرک دوم نے ان کو سسلی سے نکال کر [...] کے دو غیر آباد شہروں لوسیرا اور نوسیرا (Nocera) میں آباد کر دیا۔ ان د[...] شہروں کے مسلمانوں کی مجموعی آبادی اسی ہزار تھی جن میں سے ساٹھ ہزار نوسیرا میں ا[...] بیس ہزار لوسیرا میں رہتے تھے۔

ارباب سلطنت کو مسلمان پایا۔ وہ اس کے کیمپ میں اذان دیتے تھے اور بر سرِ عام نماز پڑھتے تھے ۔۔۔ میں جس شہر میں رہتا تھا وہ روم (Rome) سے پانچ دن کے سفر کی مسافت پر تھا۔ میں جس زمانہ میں امبراطور کے دربار سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ پوپ، جو فرنیکوں کا خلیفہ ہے اور ریدافرنس[1] (Ridafrans) نے متحد ہو کر مینفریڈا پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سے پہلے پوپ نے اس کو مسلمانوں کی جانب مائل ہونے کی بنا پر کلیسا سے خارج کر دیا تھا اسی طرح اس نے مینفریڈ کے باپ فروریک اور بھائی کورا کو بھی کلیسائے روم سے خارج قرار دیا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اسلام کی طرف مائل تھے۔ میرے آنے کے بعد مینفریڈا اور پوپ اور ریدافرنس کے متحدہ لشکر کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں امبراطور کو شکست ہوئی اور وہ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہو گیا۔ پوپ نے حکم دیا کہ اس کا سر قلم کر دیا جائے چنانچہ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی اور اس کی سلطنت ریدافرنس کے بھائی کے حوالے کر دی گئی[2]

قاضی جمال الدین نے ۶۹۷ھ (۲۸ اگست ۱۲۹۸ء) کو بمقام حماۃ وفات پائی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۳ برس کی تھی۔ سارے عالمِ اسلام میں ان کی وفات پر

---

[1] یہ فرانس کے بادشاہ لوئیس (یا لوئی) نہم کی طرف اشارہ ہے۔ عرب اس کو ری فرانس یا ریدافرنس کہتے تھے۔

[2] یہ واقعہ ۶۶۵ھ/۱۲۶۶ء میں پیش آیا اور اطالیہ وصقلیہ پر چارلس اول (Charles I) کی حکومت قائم ہو گئی۔

سوگ منایا گیا۔

شیخ الاسلام امام عزّ الدین دمشقیؒ

شیخ الاسلام علّامہ عزّ الدّین بن عبد السلام دمشقیؒ کا شمار علمائے اُس مقدس جماعت میں ہوتا ہے جس کے علم و فضل۔ زہد و ورع۔ حق گوئی و بے باکی اور جرأت و استقامت کے درخشندہ واقعات سے تاریخ اسلام کے صفحات جگمگا رہے ہیں۔

علّامہ عزّ الدّین ۵۷۷ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے اور اُس دور کے مشاہیر سے تعلیم حاصل کی۔ ان میں سیف الدین آمدیؒ۔ حافظ ابو محمد القاسم اور فخر الدین ابن عساکر جیسے اکابر علماء شامل تھے۔ انہوں نے سنِ بلوغت کو پہنچنے سے پہلے قرآن۔ حدیث۔ فقہ۔ تفسیر اور دوسرے علوم اسلامی میں درجۂ تبحّر حاصل کر لیا اور چند سال کے اندر اندر ان کی شمیم علم و فضل کی عطر بیزیوں سے تمام عالم اسلام مہک اٹھا اور ان کو "سلطان العلماء" اور امام وقت تسلیم کیا گیا۔ ان کے ہم عصر علّامہ شیخ جمال الدین ابن حاجبؒ (متوفی ۶۴۶ھ ۱۲۴۹ء) لکھتے ہیں کہ

"فقہ میں عزّ الدّین بن عبد السلام کا پایہ امام غزالیؒ کے برابر ہے۔"

امام ذہبیؒ (متوفی ۷۴۸ھ ۱۳۴۸ء) کا قول ہے کہ:

"عزّ الدّین علم فقہ اور زہد و ورع میں درجۂ کمال پر پہنچے ہوئے تھے اور درجۂ اجتہاد اُن کے رتبہ کے لائق تھا۔"

علامہ موصوف کئی سال تک دمشق کے زاویہ غزالیہ میں درس دیتے رہے اس کے ساتھ ہی وہ جامع اموی میں خطابت اور امامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ الملک الکامل نے ان کو دمشق کا عہدۂ قضا باصرار پیش کیا لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے میں عذر کیا البتہ دربارِ بغداد میں ایوبی حکومت کا سفیر بننا قبول کر لیا۔ کچھ عرصہ یہ خدمت انجام دینے کے بعد دمشق واپس آ گئے اور حسب سابق درس و افتاء اور وعظ و ہدایت میں مشغول ہو گئے۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ لوگوں کے اصرار پر انہوں نے دمشق کا عہدۂ قضا بھی قبول کر لیا۔

شیخ عزالدین بڑے خوددار با وقار اور بارعب تھے وہ درباروں کے جھنجھٹوں سے بالکل آزاد تھے اور اپنے تبحّر علمی، زہد و ریاضت اور حق گوئی کی بدولت شام کی سب سے بڑی دینی شخصیت متصوّر ہوتے تھے۔ ۶۳۷ھ میں دمشق کے فرماں روا الملک الصالح اسماعیل نے اپنے حریف الملک الصالح نجم الدین ایوب شاہِ مصر کے خلاف فرنگیوں سے دوستانہ معاہدہ کر لیا اور اُن کو نہ صرف صیدا، شقیف اور چند دوسرے قلعوں کا پروانہ لکھ دیا بلکہ کُھلے بندوں دمشق میں گھومنے پھرنے کی اجازت بھی دے دی۔ وہ بے دھڑک دمشق میں داخل ہوتے تھے اور یہاں سے ہتھیار خرید کر لے جاتے تھے۔ شیخ کو اسمٰعیل کی بے حمیتی سے سخت صدمہ پہنچا اور انہوں نے فتوٰی جاری کر دیا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار بیچنا حرام ہے کیونکہ وہ دشمنانِ اسلام ہیں اور یہی ہتھیار مسلمانوں کے خلاف استعمال کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خطبہ سے بادشاہ (صالح اسماعیل) کا نام خارج کر دیا اور اس کے لیے دعا ترک کر دی۔ اس کے بجائے وہ خطبہ سے فارغ ہو کر بڑے جوش اور تضرّع کے ساتھ یہ دعا مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ وَاجْعَلْنَا مِنْهُمْ

وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍؐ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنْھُمْ

(الٰہی! اسلام اور دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں کی مدد اور نصرت فرما اور دشمنانِ اسلام کو ذلیل فرما اور ہمیں ایسے بے دین گروہ سے بچا)۔

اسماعیل کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو وہ سخت غضب ناک ہوا اور شیخ کو عہدہ قضا اور دوسرے دینی مناصب سے معزول کر دیا۔ ایک روایت کے مطابق اس نے شیخ رح کو کچھ عرصہ نظر بند بھی رکھا۔ اسمٰعیل کی سختیوں کے باوجود شیخ اپنے موقف پر برابر ڈٹے رہے۔ لیکن جب اسماعیل کی بے حمیتی میں المنصور ابراہیم والی حمص بھی شریک ہو گیا اور دمشق و حمص کے مسلمانوں کی بے بسی حد سے گزر گئی تو شیخ رح سخت بد دل ہوئے اور انہوں نے مصر کا عزم کیا۔ لوگوں کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو ان میں سخت اضطراب پیدا ہو گیا۔ چنانچہ امراء اور اعیانِ شہر کا ایک وفد (اسماعیل کے ایماء پر یا خود ہی) شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے استدعا کی کہ آپ مصر جانے کا ارادہ ترک کر دیں ہم والیٔ دمشق کو راضی کر لیں گے آپ صرف اتنا کریں کہ ملک اسماعیل کے پاس جا کر اس کی دست بوسی کر لیں۔ شیخ نے فرمایا:

"صاحبو! مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ بادشاہ میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی کروں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس آفت سے آزاد رکھا ہے جس میں تم گرفتار ہو لوگو! تم کسی اور عالم میں ہو اور میں کسی اور عالم میں۔"

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد شیخ مصر تشریف لے گئے۔ والیٔ مصر الملک الصالح نجم الدین ایوب نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مصر کے صیغۂ قضا کے

علاوہ ان کو محکمہ اوقاف کا سربراہ مقرر کیا اس کے ساتھ ہی اس نے جامع عمرو بن عاصؓ کی خطابت شیخ کے سپرد کی۔ سلطان نے جب مدرسۂ صالحیہ کی بنیاد رکھی تو شیخ کو اس مدرسہ کا استاذِ اعلیٰ مقرر کیا اور وہ پورے انہماک اور دل جمعی کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ نجم الدین ایوب اگرچہ اسمٰعیل والیٔ دمشق کو شکست دے کر ولایتِ شام بھی اپنے حیطۂ اقتدار میں لا چکا تھا۔ لیکن شیخ نے دمشق واپس جانا پسند نہ کیا اور مصر ہی میں مقیم رہ کر بندگانِ خدا کو مستفیض کرتے رہے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنا شیوۂ حق گوئی قائم رکھا اور کسی دینی معاملہ میں کبھی مداہنت یا سکوتِ مصلحت آمیز سے کام نہ لیا۔

ایک دفعہ سلطانی حاجب امیر فخر الدین نے ایک مسجد کی چھت پر طبل خانے کی عمارت بنوائی جس میں نوبت بجائی جاتی تھی۔ شیخ کو علم ہوا تو انہوں نے بحیثیت قاضی و مہتمم مساجد اس عمارت کو فوراً گرانے کا حکم دیا اور امیر فخر الدین کو اس کی تعمیر کے جرم میں ساقط الشہادۃ قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے عہدۂ قضا سے استعفا دے دیا اور عدالت سے اٹھ کر گھر آ گئے۔ ملک صالح نے خود جا کر اس بالاخانہ کو منہدم کروا دیا اور شیخ کو راضی کر کے دوبارہ مسندِ عدالت پر لایا (ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلطان نے عہدۂ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر موزوں مناسب نہ سمجھا تاہم اس کی نگاہ میں اُن کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی) ادھر امیر فخر الدین کا خیال تھا کہ اس کے ساقط الشہادۃ ہونے کے بارے میں شیخ کے اعلان کا اس پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسی زمانہ میں سلطانِ مصر نے خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ کے پاس ایک سفارت بھیجی۔ سفیر نے خلیفہ کی خدمت میں باریاب ہو کر سلطانِ مصر کا پیغام دیا تو اس نے پوچھا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطان کی زبانی سنا ہے یا کسی اور سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام

حاجب سلطانی امیر فخر الدین کی زبانی سُنا ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی زبان کا کہا ہوا معتبر نہیں ہے کیونکہ شیخ عزّ الدین نے اس کو ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے چنانچہ سفیر پھر مصر واپس آیا اور براہِ راست سلطان سے پیغام لیا اور دوبارہ بغداد جاکر خلیفہ کو پہنچایا۔

ایک دفعہ الملک الصالح پورے تزک و احتشام کے ساتھ دربار میں بیٹھا تھا کہ شیخ وہاں پہنچے اور بڑے جلال کے ساتھ بادشاہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"اے ایوب! اتم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے جب پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں سلطنت اس لیے دی تھی کہ اس میں آزادی سے شراب پی جائے۔"

بادشاہ نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

شیخ نے فرمایا "فلاں جگہ شراب آزادی سے بک رہی ہے اور دوسرے فواحشات و منکرات ہو رہے ہیں اور تمہیں خبر ہی نہیں"

بادشاہ نے کہا کہ یہ سب کچھ میرے والد کے زمانے سے ہو رہا ہے میرا اس میں کچھ دخل نہیں۔

شیخ نے کڑک کر فرمایا: "تو پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جو تبلیغِ حق کے جواب میں یہ کہتے تھے کہ یہ ہمارے باپ دادا کے زمانے سے ہوتا چلا آرہا ہے۔"

بادشاہ یہ سن کر تھرّا اٹھا اور اس نے اسی وقت شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کر دیا۔

شیخ اپنی قیامگاہ پر واپس آئے تو ایک شاگرد نے پوچھا کہ حضرت آپ نے ... بادشاہ کو اس طرح ڈانٹا کیا آپ کو کچھ ... نہیں ہوا

شیخ نے فرمایا کہ:

"بادشاہ کی شان و شوکت اور لوگوں کو اس کے سامنے سر جھکاتے دیکھ کر مجھے اندیشہ ہُوا کہ کہیں وہ تکبّر کا شکار نہ ہو جائے اس کا علاج میرے نزدیک یہی تھا کہ اُس کو بھرے دربار میں اپنی کوتاہی پر متنبّہ کیا جائے۔ اس وقت ہیبتِ الٰہی مجھ پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ بادشاہ مجھ کو ایک بلّی سے بھی حقیر معلوم ہوتا تھا۔"

اس قسم کے متعدد واقعات شیخ کے اوراقِ سیرت کی زینت ہیں فی الحقیقت شیخ ایک مُنارۂ نور تھے جس کی ضیا پاشیوں نے مسلمانانِ مصر و شام کے قلوب کو برسوں تک منوّر رکھا مسلمانوں پر جب کبھی اعدائے اسلام کی یورش ہوئی شیخ کی ذات نے ہمیشہ ان کے لیے ایک مضبوط ڈھال کا کام دیا کیونکہ ان کے ولولہ انگیز مواعظ و خطبات مسلمانوں کے دلوں میں شوقِ جہاد کے شعلے بھڑکا دیتے تھے اور وہ دشمن کے مقابلے پر جان کی بازی لگا دیتے تھے۔

ایوبیوں کے بعد ملوک برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے بھی شیخؒ کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہ کی اور وہ بدستور مصر کی سب سے بلند دینی شخصیت تسلیم کیے جاتے رہے۔ سنہ ۶۵۸ھ میں سلطان بیبرس نے تختِ حکومت پر قدم رکھا تو شیخ اسّی برس کی عمر کو پہنچ چکے تھے اور برابر اہلِ مصر کے دلوں پر حکمرانی کر رہے تھے۔ صلیبیوں اور تاتاریوں سے معرکہ آرائیوں میں بیبرس نے جو نمایاں کارنامے سرانجام دیئے تھے ان کی بنا پر وہ شیخ کی دلی دعاؤں کا مستحق بن گیا تھا چنانچہ شیخ نے اس کے سریر آرائے حکومت ہونے کا خیر مقدم کیا۔ سلطان پہلے ہی شیخ کا عقیدت مند تھا اب وہ اُن کا پہلے سے کہیں زیادہ احترام کرنے لگا یہاں تک کہ کوئی کام اُن سے [illegible] کرتا تھا۔ سنہ ۶۶۰ھ میں جب اس نے مصر میں خلافت عباسیہ

کا احیاء کیا تو جب تک شیخ نے نئے خلیفہ المستنصر باللہ کی بیعت نہ کی کسی دوسرے نے اس کی بیعت کے لیے ہاتھ آگے نہ بڑھایا۔ شیخ نے ۶۶۲ھ میں چورانوے سال کی عمر میں سفر آخرت اختیار کیا۔ سارے عالم اسلام نے ان کی موت کا سوگ منایا۔ سلطان بھی کئی دن تک ان کی موت کے صدمے سے نڈھال رہا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شیخ عزالدینؒ کی زندگی میں حکومت کے سربراہ وہی تھے ان کی وفات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک پہاڑ میرے سر پر رکھ دیا گیا ہے۔ حقیقت میں میری حکومت ان کی موت کے بعد شروع ہوئی۔

ابن عبد الظاہر ۶/

محی الدین ابوالفضل عبداللہ بن رشید الدین ابو محمد عبدالظاہر کا شمار بحری ممالیک کے عہد کے مشاہیر میں ہوتا ہے وہ ۹ محرم ۶۲۰ھ (مطابق ۱۲ فروری ۱۲۲۳ء) کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ اور ۴ رجب ۶۹۲ھ/۱۲۹۳ء کو وہیں وفات پائی۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز، مؤرخ، سیرت نگار اور شاعر تھے۔ انہوں نے تین بحری مملوک سلاطین، الملک الظاہر بیبرس، المنصور قلاؤون اور الاشرف خلیل کے عہد میں صاحب دیوان انشاء کی حیثیت سے کئی اہم کام سرانجام دیے۔ بیبرس کے دور حکومت میں انہوں نے متعدد اہم دستاویزات کے مسودے تیار کیے۔ ۶۵۹ھ میں سلطان بیبرس نے مصر میں خلافت عباسیہ کا احیاء کیا تو خلیفہ کا خطبہ ابن عبدالظاہر ہی نے لکھا۔ ۶۶۲ھ میں انہوں نے بیبرس کے اس فرمان کا مسودہ تیار کیا جس کی رو سے الملک السعید ولی عہد قرار پایا۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے الملک ... آپ نے

قلاوون کی بیٹی کی شادی کا نکاح نامہ مرتّب کیا۔ علاّمہ جلال الدین سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ سنہ ۶۷۴ھ میں سلطان بیبرس نے نوبہ فتح کیا تو اس موقع پر ابن عبدالظاہر نے ایک زوردار تہنیتی قصیدہ لکھا۔ علامہ موصوف نے بہت سی تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب الروضۃ البہیّۃ الزاہرۃ فی خطط المعزّیۃ القاہرہ۔
۲۔ سیرت الملک الظاہر بیبرس۔
۳۔ سیرت الملک المنصور سیف الدین قلاوون۔
۴۔ سیرت الملک الاشرف صلاح الدین خلیل۔
۵۔ تمام الحمائم۔ یہ ایک عجیب وغریب کتاب ہے جس میں علاّمہ ابن عبدالظاہر نے نامہ بر کبوتروں کے حالات بڑی شرح وبسط کے ساتھ لکھے ہیں اور ان کبوتروں کی نسلوں۔ عادات وخصائل۔ پیغام رسانی اور پیغام نویسی کے متعلق بے شمار دلچسپ اور قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ انہوں نے یہ کتاب رنگین مسجّع طرز کی نہایت فصیح وبلیغ نثر میں لکھی ہے۔

علاّمہ ابن منظورؒ

علاّمہ ابوالفضل جمال الدین محمّد بن مکرم الافریقی المصری الانصاری الخزرجی الرّویفعی معروف بہ ابن منظور کا شمار ساتویں صدی ہجری کے سرآمد روزگار علماء میں ہوتا ہے۔ ۲۲ محرّم سنہ ۶۳۰ھ/۱۲۳۲ء کو قاہرہ کے ایک ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے۔ اب وہ اُن [illegible] کے علماء سے تعلیم حاصل کی اور سنِ بلوغ کو پہنچنے تک مختلف علوم

میں درجۂ تبحر حاصل کر لیا۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے خطاط، زود نویس اور انشا پرداز تھے حدیث میں وہ کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ کر سکے لیکن نحو و لغت میں ان کو امام عصر تسلیم کیا گیا۔ تاریخ و ادب میں بھی ان کو درجۂ کمال حاصل تھا کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ مصر میں وہ کاتب الانشاء الشریف کے فرائض انجام دیتے رہے، ایک مدت تک مکہ معظمہ میں بھی قیام رہا۔ فلپ کے حتی کا بیان ہے کہ ابن منظور، طرابلس میں قاضی بھی رہے[1]۔ سلطان بیبرس کے عہد میں علامہ ابن منظور کے علمی کمالات کا تمام عالم اسلام میں ڈنکا بج رہا تھا۔ علّامہ موصوف نے ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور متعدد بلند پایہ تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سب سے اہم اور مشہور تصنیف "لسان العرب" ہے۔ یہ عربی زبان کی نہایت ضخیم اور جامع لغت ہے اور مشرق و مغرب کے تمام علمائ نے اس کے محاسن کا اعتراف کیا ہے۔ اس شاہکار تصنیف کے علاوہ علّامہ ابن منظور نے ادب اور تاریخ کی بے شمار کتابوں کا اختصار کیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ تاریخ بغداد للخطیب بغدادی۔
۲۔ تاریخ بغداد لابن النجّار۔
۳۔ تاریخ دمشق لابن عساکر۔
۴۔ الحیوان للجاحظ۔
۵۔ صفوۃ الصفوۃ لابن الجوزی۔
۶۔ العقد لابن عبد ربہ۔
۷۔ تاریخ بغداد لابن سعد السمعانی۔

---

[1] تاریخ لبنان ترجمہ غلام رسول مہرؔ

۸۔ زہر الآداب للحصری۔

۹۔ نشوار المحاضرۃ للتنوخی۔

۱۰۔ یتیمۃ الدہر للثعالبی وغیرہ۔

ان کے علاوہ علامہ موصوف کی تصنیف "نثار الازہار فی اللیل والنہار" نے اپنی ادبی خوبیوں کی بناء پر بڑی شہرت پائی۔

سبطِ ابن الجوزیؒ

شمس الدین ابو المظفر یوسف بن قیزاوغلو معروف بہ سبط ابن جوزی ۵۸۲ھ/۱۱۸۶ء میں بمقام بغداد پیدا ہوئے۔ مشہور محدث علامہ ابن جوزی کے نواسے تھے اور انہیں کے زیرِ سایہ پرورش اور تعلیم پائی۔ ۶۰۰ھ میں سفر پر نکلے اور بالآخر دمشق میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ سلطان بیبرس کے عہد میں وہ یہیں درس و تدریس اور وعظ و افتاء کے ذریعے ایک دنیا کو مستفیض کر رہے تھے۔ ۶۸۴ھ/۱۲۸۶ء میں انتقال کیا وہ کئی معرکۃ الآراء کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ تفسیر القرآن۔

۲۔ شرح جامع الکبیر۔

۳۔ مرآت الزمان فی تاریخ الاعیان۔

۴۔ تذکرہ خواص الامۃ بذکر خصائص الائمۃ۔

قاضی جمال الدین بن مالک الطائیؒ

قاضی جمال الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن محمد بن عبداللہ مالک الطائی معروف بہ ابنِ مالک اپنے دور کے کاملین علماء و فضلاء اور شعراء میں سے تھے۔ سنہ ۶۰۰ھ سے لگ بھگ اندلس کے شہر جیان میں پیدا ہوئے۔ پہلے جیان کے بہر بر آوردہ علماء سے تعلیم حاصل کی پھر دمشق آ گئے اور وہاں کے مشاہیر علماء سے نحو اور حدیث پڑھی۔ تحصیلِ علم سے فارغ ہونے کے بعد حلب میں نحو پر درس دینا شروع کیا اور وہیں مدرسۃ العادلیہ کے امام مقرر ہو گئے پھر حماۃ آ گئے چند سال بعد وہاں سے رختِ سفر باندھا اور دمشق آ کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور وہیں ۶۷۲ھ / ۱۲۷۴ء میں وفات پائی۔ سلطان بیبرس کے عہد میں ان کی شہرت اوجِ کمال پر تھی اور وہ حجۃ العرب کے لقب سے مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ عربی ادب اور لغت میں ان کے فضل و کمال کے سامنے امام سیبویہ کی شہرت بھی ماند پڑ گئی تھی۔ نہایت عابد و زاہد، بلند اخلاق اور زیرک تھے ان کے شاگردوں میں امام نوویؒ، قاضی بدر الدین بن جماعۃ، بہاؤ الدین بن النحاس حلبی اور شیخ ابوالحسین الیونینیؒ نے بڑی شہرت پائی۔ ابن مالکؒ کی چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۔ الکافیۃ الشافیہ۔

۲۔ کتاب تسہیل الفوائد و تکمیل المقاصد۔

۳۔ کتاب العروض۔

۴۔ کتاب الالفاظ المختلفہ۔

۵۔ ایجاز التعریف فی علم التصریف۔

۶۔ سبک المنظوم وفک المختوم۔

۷۔ کتاب الخلاصۃ الالفیہ۔

۸۔ کتاب شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح۔

قاضی بدرالدین ابن جماعۃؒ

قاضی بدرالدین ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم الکنانی الحموی ۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء میں بمقام حماۃ پیدا ہوئے۔ علماء کے ایک جلیل القدر خاندان سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے درس و تدریس اور قانون و ادب میں بڑا نام پیدا کیا۔

سلطان بیبرس کے عہد میں دمشق کے ایک مدرسہ میں معلم تھے۔ اس کی وفات کے بعد ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء میں یروشلم کے قاضی بنائے گئے۔ ۶۹۰ھ/۱۲۹۱ء میں قاہرہ اور ۶۹۳ھ/۱۲۹۴ء میں دمشق کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ ۷۰۲ھ/۱۳۰۲ء میں دوبارہ قاہرہ کے قاضی القضاۃ بنائے گئے اور تقریباً چوبیس برس تک اس عہدے پر قائم رہے۔ ۷۳۳ھ/۱۳۳۳ء میں وفات پائی۔ متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں جن میں سے دو اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:-

۱۔ تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام (آئینی قانون کے موضوع پر ہے)

۲۔ تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم (تعلیم و تربیت کے موضوع پر ہے)

ابن شداد حلبیؒ

عزالدین ابوعبداللہ محمد بن علی بن ابراہیم الانصاری الحلبی معروف بہ ابن شداد

بیبرس کے زمانے میں مشہور مؤرّخ و سوانح نگار تھے۔ ۶۱۳ھ/۱۲۱۷ء میں بمقام حلب پیدا ہوئے اور ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء میں قاہرہ میں وفات پائی۔ ان کی مشہور تصنیفات کے نام یہ ہیں :-

۱- سیرۃ الملک الظاہر بیبرس (اس کا ترکی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے)۔

۲- الاعلاق الخطیرۃ فی ذکر امراء الشام والجزیرہ۔ (یہ شام و الجزیرہ کی تاریخ ہے اور اس میں وہاں کی مشہور شخصیتوں کے حالات بھی شرح و بسط کے ساتھ درج ہیں)۔

۳- تاریخ حلب۔

بعض مؤرخین نے ان کو قاضی بہاؤ الدین ابو المحاسن یوسف بن رافع مصنف "النوادر السلطانیہ والمحاسن الیوسفیہ" (سیرت سلطان صلاح الدین) کے ساتھ ملتبس کر دیا ہے اور "سیرۃ الملک الظاہر بیبرس" کو بھی انہی کی تصنیف بتایا ہے حالانکہ قاضی موصوف ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء میں وفات پا چکے تھے اور ملک الظاہر بیبرس کا دورِ اقتدار ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں شروع ہوا۔

قاضی عبد الرحمٰن بن قدامہؒ

قاضی شمس الدین عبد الرحمٰن بن محمّد بن احمد بن محمد بن قدامہ، بیبرس کے عہد میں فقہ حنبلی کے یگانۂ روزگار عالم تھے۔ ۵۹۷ھ میں قاسیون میں پیدا ہوئے ان کے والد ابو عمر محمد اور چچا موفق الدین ابو محمد عبد اللہ اپنے دور کے سرآمد روزگار علماء میں سے تھے۔ ان دونوں نے بھی ابن قدامہ ہی کے نام سے شہرت پائی)۔

قاضی عبدالرحمان نے اپنے والد اور چچا کے علاوہ اس دور کے کئی دوسرے مشاہیر علما سے علم حاصل کیا اور چند سال کے اندر اندر مختلف علوم میں درجۂ تبحر پر فائز ہو گئے۔ سلطان بیبرس نے جب دمشق میں الگ الگ مذہب کے قاضی مقرر کیے تو ان کو حنابلہ کا قاضی بنایا۔ اپنے علم و فضل کی وجہ سے لوگوں میں "شمس الدین" کے لقب سے مشہور تھے۔ نہایت حلیم الطبع اور بُردبار تھے شکل و صورت سے وجاہت اور وقار ٹپکتا تھا۔ عہدۂ قضاء کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن سلطان کے اصرار پر اس کو بارہ برس تک نباہتے رہے۔ ۶۸۲ھ میں وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں دو کتابیں مشہور ہیں :

۱۔ الشافی (الشرح الکبیر)
۲۔ تسہیل المطلب فی تحصیل المذہب۔

ابوشامہ مقدسیؒ

شہاب الدین ابومحمد عبدالرحمان بن اسماعیل المقدسی الشافعی معروف بہ ابوشامہ عہد بیبرس کے نامور مؤرخ و ماہر ادبیات تھے۔ ۲۳ ربیع الثانی ۵۹۹ھ (مطابق ۱۰ جنوری ۱۲۰۳ء) کو دمشق میں پیدا ہوئے اور تقریباً ساری زندگی یہیں گزار دی۔ ابوشامہ صرف چار موقعوں پر دمشق سے باہر نکلے پہلی مرتبہ حصول تعلیم کے لیے مصر گئے اور اسکندریہ میں ایک سال رہ کر فقہ و ادبیات وغیرہ کی تعلیم پوری کی۔ دوسری مرتبہ صرف چودہ دن کے لیے القدس گئے اس کے بعد دو مرتبہ حج کے لیے حجاز گئے۔ ۶۶۰ھ میں دمشق کے "المدرسۃ الرکنیۃ" اور "المدرسۃ الاشرفیہ"

یہ مدرس مقرر ہوئے اور پانچ سال تک نہایت حسن و خوبی سے درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۹ رمضان المبارک ۶۶۵ھ مطابق ۱۳ جون ۱۲۶۸ء کو وفات پائی۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ لوگوں نے انہیں کسی جرم کے شبہ میں قتل کر ڈالا۔ علامہ ابوشامہؒ نے متعدد گراں قدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین۔ اس میں سلطان نورالدین زنگیؒ اور صلاح الدین ایوبیؒ کے حالات درج ہیں۔

۲۔ تاریخ دمشق۔ یہ ابن عساکر کی تاریخِ دمشق کا خلاصہ ہے۔

۳۔ ابرز المعانی۔ قصیدہ شاطبیہ کی شرح ہے۔

۴۔ الذیل علی الروضتین۔ یہ کتاب الروضتین کا ذیل ہے۔ یہ کتاب تاریخ سے زیادہ سیر پر مشتمل ہے۔

۵۔ مختصر کتاب المؤمل للرد الی الامر الاول۔

۶۔ الباعث علی انکار البدع والحوادث۔

۷۔ المرشد الوجیز۔

۸۔ علم الدین السخاوی کی سات تغتیہ نظموں کی شرح۔

ابوشامہؒ کی کئی دوسری تصانیف حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گئیں۔

ابن ابی اصیبعہ

موفق الدین ابوالعباس احمد بن القاسم بن خلیفہ بن یونس السعدی الخزرجی

معروف بہ ابن ابی اصیبعہ ۶۰۰ھ میں بمقام دمشق ایک ماہر امراضِ چشم کے گھر پیدا ہوئے۔ انہوں نے فنِ طب اور تذکرہ نویسی میں عالمگیر شہرت پائی۔ فنِ طب میں وہ ابنِ بیطار[1] کے شاگرد تھے۔ ابنِ بیطار کے علاوہ انہوں نے شیخ ابوبکر صقلی[2] اور مہذب الدین ابن الاخوار (یا دخوار)[3] سے بھی استفادہ کیا۔ ۶۴۳ھ/۱۲۴۵ء میں ابن ابی اصیبعہ

---

[1] ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن البیطار المالکی ساتویں صدی ہجری کے مشہور ماہرِ نباتیات و عقاقیر تھے۔ مشہور مستشرق ایڈورڈ جی براؤن کا قول ہے کہ "وہ صحیح معنوں میں یونانی حکیم دیسقوریدوس کے جانشین تھے۔" ابن بیطار سنِ شعور کو پہنچے تو انہوں نے اس دور کے سرآمدِ روزگار اندلسی طبیب و ماہرِ نباتیات ابنِ رومیہ کی شاگردی اختیار کی اور چند سال کے بعد خود ایک عظیم ماہرِ نباتات کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔ انہوں نے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں افریقہ۔ مراکش۔ تیونس۔ الجزائر۔ ایشیائے کوچک یونان اور پورے مصر کی طویل سیاحت کی اور الملک الکامل اور الملک الصالح ایوبی کے عہدِ حکومت میں کئی سال تک مصر کے محکمۂ نباتات کے افسرِ اعلیٰ (رئیس علیٰ سائر العشابین) رہے۔ ۶۴۶ھ میں وفات پائی۔ ان کی تصنیفات میں "کتاب الافعال الغریبہ والخواص العجیبہ"، "کتاب الجامع فی الادویۃ المفردہ" اور "کتاب المغنی فی ادویۃ المفردہ" بہت مشہور ہیں۔ ان کا کئی یورپی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

[2] شیخ ابوبکر صقلی طبیب کا شمار اپنے دور کے اساتذۂ فن میں ہوتا تھا۔ ان کے شاگردوں میں ابن ابی اصیبعہ اور شیخ عز الدین بن سویدی نے جو بیمارستان نوری دمشق کے طبیب حاذق تھے بڑی شہرت پائی۔ ابن ابی اصیبعہ "عیون الانباء" میں شیخ عز الدین کے ترجمہ میں لکھتے ہیں "میں اور عز الدین دونوں شیخ ابوبکر صقلی رحمہ اللہ کے درس میں شریک تھے اور اسی وقت سے ہم دونوں میں رشتۂ محبت قائم ہے۔"

[3] مہذب الدین ابن الاخوار (یا دخوار) (۱۱۷۰ء۔ ۱۲۳۰ء) ایوبیوں (باقی ص ۲۸۶ پر)

نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے تقریباً چار سو ایسے اطبا و حکماء کے حالات درج کیے ہیں جو علم طب اور اس کے متعلقہ فنون میں درجۂ تبحر رکھتے تھے اس کے بارھویں باب میں برکوچک پاک و ہند کے اطبا کے حالات بھی درج ہیں ۔۔۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب مشرق اور مغرب میں ہر جگہ بے مثل خیال کی جاتی ہے۔ مشہور مستشرق فلپ کے حتیٰ لکھتا ہے کہ

"اس کتاب کو عربی تصانیف میں یگانگی کا درجہ حاصل ہے"[1]

ابن ابی اصیبعہ نے ۶۳۴ھ ۱۲۳۶ء میں قاہرہ کے شاہی شفاخانے (مارستان صلاح الدین غازی) میں ایک سال تک سرکاری ملازمت کی۔[2] اس کے بعد وہ امیر عزالدین ایدمر الحلّی[3] کے طبیب خاص کی حیثیت سے صرخد چلے گئے اور اپنی وفات (۶۶۸ھ ۱۲۷۰ء) تک وہیں رہے۔ سلطان بیبرس کے عہد میں ابن ابی اصیبعہ کی شہرت اور عظمت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا اور وہ عوامی اور سرکاری حلقوں میں ہر جگہ نہایت عزت و احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۵) کے دورِ حکومت کے نامور طبیب تھے۔ وہ دمشق کے بیمارستان نوری سے وابستہ تھے۔ ان کے شاگردوں میں ابن النفیس نے بڑی شہرت پائی۔ انہوں نے ابوعلی سینا کی کتاب "قانون" کی شرح لکھ کر لقائے دوام کے دربار میں جگہ حاصل کر لی۔

[1] تاریخ شام۔ حتی۔ ترجمہ؛ غلام رسول مہر۔

[2] اس وقت الملک الکامل ایوبی کا دورِ حکومت تھا۔

[3] عزالدین ایدمر الحلّی اس زمانے کا ایک با اثر امیر تھا سلطان بیبرس نے بھی اپنے دورِ اقتدار میں اس کی بڑی توقیر کی۔ امیر موصوف نے سلطان کی مدد سے جامع ازہر کی مرمت کے بعض کاموں پر اپنے پاس سے کافی [illegible]

ابن النفیس

علاؤ الدّین ابو العلاء علی بن ابی الحزم القرشی الدمشقی معروف بہ "ابن نفیس" ساتویں صدی ہجری کے یکتائے زمانہ طبیب اور فقہ (شافعی) صرف و نحو اور منطق کے ایک جیّد عالم تھے۔ ۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) کے لگ بھگ دمشق میں پیدا ہوئے اور وہاں کے "البیمارستان النوری" میں طب کی تعلیم حاصل کی اس کے علاوہ انہوں نے دوسرے علوم متداولہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ قاہرہ چلے گئے۔ وہاں وہ ایک طرف ایک شفاخانے میں طب پڑھاتے تھے اور دوسری طرف مدرسۂ مسروریہ میں فقہ کا درس دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مصر میں انہیں "رئیس اطبّاء مصر" کا عہدہ دیا گیا تھا۔ ابن نفیس نے ۶۸۷ھ (۱۲۸۸ء) میں وفات پائی۔ انہوں نے ایک گراں قدر تصنیفی ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ان میں سے چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:

۱۔ موجز القانون یعنی قانون ابن سینا کی شرح اس کتاب نے مشرق و مغرب میں بڑی شہرت پائی اور صدیوں تک اس کی شرحیں اور شرحوں کی شرحیں لکھی جاتی رہیں۔

۲۔ شرح فصول بقراط۔

۳۔ کتاب المہذّب فی الکحل۔

۴۔ الکتاب الشامل فی الطب۔

۵۔ مختصر علم اصول الحدیث۔

۶۔ الرسالۃ الکاملیّۃ فی السیرۃ النبویۃ۔

کہا جاتا ہے کہ ابنِ نفیس کی بیشتر تصانیف طبعزاد تھیں اور ان کی تیاری میں انہوں نے دوسری کتابوں سے کوئی مدد نہیں لی تھی۔ اپنی وفات سے پہلے انہوں نے اپنا مکان اور عظیم الشان کتب خانہ قاہرہ کے "شفاخانہ منصوریہ" کے نام وصیت کر دیا تھا۔ (دائرہ معارفِ اسلامیہ)

قاری جمال الدین رحؒ

احمد نام اور لقب جمال الدین۔ سلطان بیبرس اور اُس کے پیشروؤں کے عہد میں فنِ قرأت کے امام تسلیم کیے جاتے تھے۔ بچپن ہی میں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی۔ طویل عمر پاکر ۶۶۲ھ میں بمقام قاہرہ داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

شیخ القراء کمال الدین مصری رحؒ

علی نام تھا اور حضرت عباس بن عبد المطلب کی اولاد سے تھے۔ نورِ بصارت سے محروم تھے لیکن نورِ بصیرت سے مالا مال۔ ان کی ذات اہلِ مصر کا طرۂ افتخار تھی۔ نہایت عابد و زاہد تھے۔ اور فنِ قرأت میں درجۂ کمال رکھتے تھے اس لیے شیخ القراء کے لقب سے مشہور تھے۔ امام دمیاطی فنِ قرأت میں ان کے شاگرد تھے اور ساتوں قرأتیں انہیں سے حاصل کی تھیں۔ ۹۸ برس کی عمر میں ۶۶۱ھ میں وفات پائی۔

شیخ محمد بن مکیؒ صقلیؒ

شیخ محمد بن مکی صقلیؒ عہد بیبرس میں قاہرہ کے ممتاز عالمانِ حدیث میں تھے۔ ان کے خاندان نے صقلیہ سے ہجرت کر کے دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ تاہم اس کے افراد اپنے قدیم وطن کی نسبت سے صقلی کہلاتے تھے۔ اس خاندان کو علومِ قرآن و حدیث سے بڑا شغف تھا۔ شیخ محمدؒ ۶۱۴ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب یہ ہے:

محمد بن مکی بن ابی بکر بن عبد الغنی بن یوسف بن ابی عبد اللہ ابراہیم شمس الدین ابی الحزم تقی الدین قرشی۔

سنِ شعور کو پہنچنے کے بعد شیخ موصوف نے مختلف علوم اسلامی کی تحصیل و تکمیل کی پھر کسبِ معاش کے لیے زردوزی اور نقاشی کا کام سیکھا۔ سلسلہ روزگار میں دمشق سے قاہرہ آئے اور یہاں زردوزی کے ایک کارخانے میں ملازم ہو گئے۔ آخر عمر تک یہیں رہے۔ نہایت خود دار اور درویش صفت تھے۔ ساری عمر ہاتھ سے محنت کر کے روزی کمائی اور علم کو کبھی دنیوی منفعت کا ذریعہ نہیں بنایا ۶۹۹ھ میں وفات پائی اور قاہرہ کے باب النصر میں مدفون ہوئے۔

علمِ حدیث میں مکرم بن ابی الصقر۔ ابوطاہر اسمٰعیل بن ظفر۔ ابو عبد اللہ بن زبیدی اور ابوالمنجا بن اللیثی ان کے شیوخ تھے۔

ابوالفضل مہندس دمشقی (طبیب)

موید الدین بن عبدالکریم المہندس معروف بہ ابوالفضل مہندس دمشق کے رہنے والے اور کتاب فی الحروف والسیاست کے مصنف تھے۔ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی نے اپنی کتاب "علمائے سلف و نابینا علماء" میں "عیون الانباء فی طبقات الاطباء" کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ مشہور طبیب تھے اور فن نجاری میں بھی بہت ماہر تھے۔ نجاری کا کام ان کے پاس کثرت سے آتا تھا۔ بیمارستان کبیر (شاہی شفاخانے) کے اکثر دروازے ان کے ہاتھ کے بنے تھے۔ جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں (ساعات) انھوں نے درست کی تھیں اور ان کی نگرانی کے متعلق ان کو تنخواہ ملتی تھی۔ عہد پیری میں ان کی شہرت اوج کمال پر تھی۔ ۶۹۹ھ ۱۲۹۹ء میں وفات پائی۔

امام نووی رح

نام یحییٰ بن شرف۔ کنیت ابوزکریا اور لقب محی الدین تھا۔ دنیائے اسلام میں امام النووی یا امام النواوی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ۶۳۱ھ ۱۲۳۳ء میں علاقہ دمشق کے موضع نوی (نوا) میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں قرآن شریف پڑھ کر دمشق آئے اور طب اور علوم اسلامی حاصل کیے۔ یہاں وہ مدرسہ رواحیہ میں پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے شافعی مذہب کی کتاب تنبیہ کو ساڑھے چار ماہ میں حفظ کر لیا۔

روزانہ مختلف علوم میں مختلف استادوں سے بارہ سبق پڑھتے تھے اور شب و روز مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں کمال الدین اسحاق مغربی بہت مشہور ہیں، وہ امام رافعیؒ کے بعد شافعی فقہ کے مدوّن تھے۔ امام نوویؒ نے ۶۵۱ھ میں پہلی بار اپنے والد کی معیت میں حج کیا۔ ۶۵۵ھ میں انہوں نے لکھنا شروع کیا۔ مدت تک دمشق کے مدرسہ اشرفیہ میں بلا معاوضہ حدیث پڑھاتے رہے چند سال کے اندر اندر تمام دنیائے اسلام میں ان کے علم و فضل کی شہرت ہو گئی اور وہ امامِ وقت تسلیم کیے گئے اگرچہ وہ شافعی المسلک تھے لیکن تعصب سے بالکل پاک تھے۔ چنانچہ اپنی تصانیف میں جابجا امام ابو حنیفہؒ کے اقوال نقل کرتے ہیں —

لذاتِ دنیوی اور خواہشاتِ نفسانی سے بہت پرہیز کرتے تھے اور زہد و عبادت میں ضرب المثل تھے۔ ساری ساری رات عبادت میں مصروف رہتے اور دن رات میں صرف ایک بار نمازِ عشاء کے بعد کھاتے اور صرف ایک دفعہ سحر کے وقت پانی پیتے۔ نہایت بردبار اور بلند حوصلہ تھے۔ خصوصاً بحث کے وقت نہایت تحمل اور وقار کا مظاہرہ کرتے۔ مصائب و آفات پر بھی بے حد صابر تھے۔ ساری عمر مجرد رہے۔ اس کی وجہ بظاہر ان کی عزلت پسندی تھی۔ والدین ان کو کبھی کبھار جو کچھ بھیج دیتے اسی پر گزارہ کرتے اور کسی دوسرے سے کچھ مطالبہ نہ رکھتے تھے۔

جس زمانہ میں بیبرس نے مصر اور شام کی حکومت سنبھالی (۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء) امام موصوفؒ دمشق میں مقیم تھے اور اپنے علم و فضل اور زہد و ورع کی بدولت مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔ سلطان بھی ان کے کمالاتِ علمی کا معترف تھا اور ان سے نہایت احترام سے پیش آتا تھا لیکن بدقسمتی سے ۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء میں اس کے اور امام نوویؒ کے درمیان ایک معاملہ میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا جس نے بڑا طول کھینچا۔ مسلم مؤرخین نے اس واقعہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مختلف روایتوں کا

خلاصہ یہ ہے کہ سلطان اس سال دمشق گیا اور ارادہ کیا کہ مصارفِ جہاد کے لیے اہلِ شام سے کچھ رقم وصول کرے۔ اس بارے میں حکم صادر کرنے سے پہلے اس نے حسبِ عادت علمائے سے فتویٰ طلب کیا۔ شامی علمائے نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا لیکن امام نووی نے ان سے اتفاق نہ کیا اور فتوی کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا اس پر سلطان ان سے ناراض ہو گیا[1] اور ان کو دمشق سے نکل جانے کا حکم دیا چنانچہ وہ اپنے وطن نویٰ چلے گئے۔ ان کا اس طرح شہر بدر کیا جانا شامی علماء پر بہت شاق گزرا اور ایک وفد بنا کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ نووی ہمارے امام اور سردار ہیں۔ دمشق میں ان کی موجودگی ہمارے لیے انتہائی فخر و سعادت کا باعث تھی۔ ان کے بغیر ہمیں یہاں اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے ــــ علمائے نے کچھ اس پیرائے میں گفتگو کی کہ سلطان پر رقت طاری ہو گئی اس نے اپنا حکم فوراً منسوخ کر دیا اور علمائے کے وفد سے درخواست کی کہ امام نووی کو اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس لائیں۔ جب یہ وفد امام موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کو سلطان سے بیحد کبیدہ خاطر پایا۔ انہوں نے فرمایا کہ بیبرس کی زندگی میں میں کبھی دمشق نہیں جاؤں گا۔ وفد نویٰ سے مایوس ہو کر دمشق واپس آیا اور سلطان کو امام موصوفؒ کے جواب سے مطلع کیا۔ سلطان شاید تلافیٔ مافات کے لیے کوئی اور قدم اٹھاتا لیکن قدرت نے اسے ایسا کرنے کی مہلت ہی نہ دی اور وہ چند دن بعد

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ جہاد کے مصارف پورے کرنے کے لیے سلطان نے اہلِ شام پر فوجی ٹیکس لگا دیا اور مدرسین کی تنخواہوں میں کسی قدر تخفیف کر دی۔ امام نوویؒ نے سلطان کے ان اقدامات کی سختی سے مخالفت کی اور اس کے پاس جا کر ان احکام کو منسوخ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنی عادت کے خلاف سلطان سے بڑی تند و تلخ گفتگو کی جس پر سلطان ان سے کبیدہ خاطر ہو گیا۔

عالمِ بقا کو سدھار گیا۔

مولانا محمد اسلم جیراجپوری مرحوم اپنی کتاب "تاریخ الامت" حصہ ششم[1] میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مؤرخین بالعموم امام نووی کے طرف دار ہیں اور اُن کے قول کو حق بجانب سمجھتے ہیں لیکن جن علماء نے دستخط کیے تھے وہ سب کے سب ناداں یا دنیا پرست نہ تھے۔ بلیش ازیں نیست کہ سلطان اگر اپنے گھر سے اس جہاد کے چندہ کو شروع نہ کرے تو قصور وار ہے[2] لیکن جواز میں کیا شُبہ ہے؟ کیونکہ یہ اس کا ذاتی کام نہیں ہے۔ بادشاہِ اسلام کو مدافعتِ کفار کے لیے مال دے دینا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ وہ غلبہ کر کے جان و مال دونوں پر مسلط ہو جائیں۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان ان سے برہم ہوا اور نہ علماء کی توقیر ہمیشہ اس کا شیوہ تھا۔"

عجیب اتفاق ہے کہ سلطان بیبرس کی وفات کے بعد امام نووی بھی زیادہ

---

[1] یہ کتاب فی الحقیقت مشہور مؤرخ محمد بک الخضری کی تاریخ "محاضرات الامم الاسلامیہ" کا آزاد ترجمہ ہے۔

[2] کہا جاتا ہے کہ دورانِ گفتگو میں امام نووی نے سلطان سے کہا کہ تو امیر بندقدار کا زرخرید غلام تھا اور ایک حبہ کا مالک بھی نہ تھا۔ اب اللہ نے تجھے سلطنت دی ہے اور تو اس قدر غلاموں اور کنیزوں کا مالک ہے جن کے سازو سامان طلائی ہیں۔ جب تک تو ان سے یہ سارا ساز و سامان فوجی ضرورت کے لیے نہ لے لے میں غریب مسلمانوں سے مال لینے کا فتویٰ تیرے حق میں کیسے لکھ سکتا ہوں۔

عمر نہ جیئے۔ اور اسی سال (۶۷۶ھ میں) داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتالیس برس کی تھی اور ان کے والدین بقید حیات تھے۔

امام نوویؒ کا شمار بہت بڑے محدثین میں ہوتا ہے۔ وہ نقد احادیث میں بہت سخت تھے اور فن حدیث میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد حنبل کو دوسری تمام کتب احادیث پر ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں کی شرح لکھی۔ ان کی شرح صحیح مسلم علمی دنیا میں بڑی مشہور اور مقبول ہوئی۔ اس کی تصنیف کے زمانے سے آج تک علماء اس سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ شرح بڑی مفصل ہے اور علماء کے نزدیک اس کو جامع علوم کا درجہ حاصل ہے اس کے باوجود امام موصوف اس شرح کی بابت لکھتے ہیں:

لولا ضعف الهمم وقلة الراغبين لبسطت فبلغت به ما يزيد على مائة مجلدات ولكن اقتصر على التوسط "یعنی اگر لوگوں کی ہمتیں کمزور نہ ہو گئی ہوتیں اور علم کے راغب کم نہ ہو گئے ہوتے تو میں اس شرح کو مبسوط کر کے لکھتا پس یہ سو جلدوں تک پہنچتی لیکن میں میانہ روی پہ کفایت کرتا ہوں"

اس شرح میں امام موصوف نے علم و تاریخ حدیث پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختصر عبارت میں مطول مطالب کو ایسے احسن طریقہ سے بیان کیا ہے کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ان شرح کے علاوہ امام نوویؒ کی دوسری مشہور تصانیف یہ ہیں: ریاض الصالحین۔ بستان العارفین۔ منہاج الطالبین۔ کتاب الاربعین۔ کتاب الاذکار۔ تہذیب الاسماء واللغات۔ علم نحو اور فن تذکرہ میں کچھ اور تصانیف بھی ہیں لیکن انہوں نے زیادہ شہرت نہیں پائی۔

مآخذ

اس کتاب کی ترتیب وتدوین میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ تاریخ ابوالفداء۔
۲۔ تاریخ ابن خلدون۔
۳۔ محاضرات الامم الاسلامیہ محمد بک الخضری۔
۴۔ تاریخ الخلفاء جلال الدین سیوطی۔
۵۔ الفخری محمد ابن علی ابن طباطبا المعروف بابن الطقطقی۔
۶۔ تاریخ التمدن الاسلامی جرجی زیدان۔
۷۔ تمدنِ عرب ڈاکٹر گستاولی بان ترجمہ سید علی بلگرامی۔
۸۔ محاربات صلیبی ریلجس ٹریکٹ سوسائٹی
(منعقدہ ۱۸۹۹ء) ترجمہ مولوی محمد معشوق حسین خاں
۹۔ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام
(دائرہ معارفِ اسلامیہ) دانش گاہِ پنجاب لاہور
۱۰۔ دی پریچنگ آف اسلام سر تھامس آرنلڈ
(اردو ترجمہ محمد عنایت اللہ دہلوی۔ "دعوتِ اسلام")
۱۱۔ تاریخ زوال رومتہ الکبریٰ (عہد اسلام) ایڈورڈ گبن (انگریزی)
۱۲۔ تاریخِ اسلام سید امیر علی "
۱۳۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لیڈن "
۱۴۔ تاریخ مشرق وسطیٰ جی۔ای۔کرک "
۱۵۔ تاریخِ شام فلپ کے حتی اردو ترجمہ غلام رسول مہر

۱۶۔ تاریخ لبنان — فلپ کے حتی — اردو ترجمہ غلام رسول مہر

۱۷۔ تاریخ ممالیک مصر — سر ولیم میور — انگریزی

۱۸۔ مسلمانوں کا نظم مملکت — ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن و علی ابراہیم حسن مصری
اردو ترجمہ مولوی محمد علیم اللہ صدیقی

۱۹۔ مسلمانوں کا عروج و زوال — مولانا سعید احمد

۲۰۔ تاریخ ملک عراق — پروفیسر محمود بریلوی

۲۱۔ تاتاریوں کی یلغار — ہیرالڈ لیم — اردو ترجمہ عزیز احمد

۲۲۔ تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات — عبداللہ عنان
اردو ترجمہ محمد عبدالوہاب ظہوری

۲۳۔ حیات سراج الدین — قاضی سراج الدین احمد

۲۴۔ تاریخ اسلام — اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔

۲۵۔ تاریخ صقلیہ — سید ریاست علی ندوی

۲۶۔ تاریخ اسلام — مرتضیٰ احمد خان

۲۷۔ تاریخ اسلام — محمود الحسن صدیقی۔ چراغ حسن حسرت۔ ڈاکٹر ریاض الاسلام

۲۸۔ تاریخ ملت حصہ ہفتم — مفتی انتظام اللہ شہابی

۲۹۔ نگار — فرمانروایان اسلام نمبر (مرتبہ نیاز فتحپوری)

۳۰۔ نگار — علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر " "

۳۱۔ سلاجقہ — سید ابوالاعلیٰ مودودی

۳۲۔ بغداد — خواجہ عباد اللہ اختر

۳۳۔ دمشق — " "

۳۴۔ طب العرب — ایڈورڈ جی براؤن — ترجمہ حکیم علی احمد نیر واسطی۔

—— ختم ——

باسمہٖ سبحانہٗ

الملک الظاہر

سلطان العادل رکن الدین محمود

بیبرس بندقدار

مؤلفہ

طالب ہاشمی

قومی کتب خانہ ۶۵ ریلوے روڈ، لاہور
(پاکستان)